دینی، علمی، فکری، ادبی، سیاسی، سماجی اور اصلاحی
مضامین کا مجموعہ

شعور و آگہی

مفتی محمد قاسم اوجھاری

ناشر:
اسلامی مرکز تحقیق و اشاعت، اوجھاری، ضلع امروہہ، یوپی، انڈیا

تفصیلات

نام کتاب: شعور وآگہی
مرتب: محمد قاسم اوجھاری
صفحات: ۲۲۸
سن اشاعت: ربیع الاول ۱۴۴۴ھ اکتوبر ۲۰۲۲ء
ناشر: اسلامی مرکز تحقیق واشاعت، اوجھاری، ضلع امروہہ، یوپی، انڈیا

Published By:
islamic Research & Publication's Center
Ujhari, District Amroha, UP, India (244242)

Email: Qasimujhari1@gmail.com Qasimujhari@yahoo.com
Mobile: 9719452901

اس کتاب میں۔۔۔

بکھرے ہوئے کچھ موتیوں کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے، مختلف ومتنوع موضوعات پر مضامین کو سپرد قلم کیا گیا ہے، اہل ضرورت اور ارباب ذوق کو ان ادھورے خاکوں میں بہت کچھ سامان مل سکتا ہے، اس میں دینی وفکری شعور بھی مل سکتا ہے اور سماجی آگہی بھی، دل میں درد اور طبیعت میں احساس ہو تو برگ وگل کو دیکھ کر بہت کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے، اہل بصیرت کے لیے گھاس کی ایک پتی بھی صحیفۂ فطرت سے کم نہیں ہے۔

فہرست مضامین

مقدمہ

بے انتہا حمد وسپاس اس ذات کے لیے ہے، جس نے مشت خاک کو جامۂ انسانیت پہنایا، پھر اس کے سر پر اشرفیت کا تاج رکھا اور اس کو علم وصلاحیت عطا فرمائی۔ اور بے پایاں رحمتیں اور سلامتی نازل ہو اس ذات پر، جس نے جہالت کے پردوں کو ہٹایا، علم کی شمعیں روشن کیں اور لوگوں کو لکھنا پڑھنا سکھایا۔

یہ حقیقت ہے کہ کسی بھی موضوع پر قلم اٹھانا اور کچھ تحریر کرنا بہت ہی مشکل کام ہوتا ہے اور کمال احتیاط مدنظر رکھنی پڑتی ہے، کیوں کہ تصنیف وتالیف کا گزر عام وخاص دونوں سے ہوتا ہے اور وہ تحسین وتنقید دونوں نظروں سے دیکھتے ہیں۔ مشہور مقولہ ہے، جس کو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کے مقدمے میں ذکر کیا ہے، **من صنف فقد استھدف**۔ کہ جو آدمی تصنیف وتالیف کا بیڑا اٹھاتا ہے وہ نشانہ بنتا ہے۔ ''عتابی'' کا یہ مقولہ بھی مشہور ہے: **من صنع کتابا فقد استشرف للمدح او الذم، فان احسن فقد استھدف للحسد و الغیبۃ، و ان اساء فقد تعرض للشتم**۔ کہ جو شخص کتاب لکھتا ہے اسے تعریف یا برائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اگر اس نے کتاب اچھی تیار کی تو وہ حسد اور غیبت کا نشانہ بنتا ہے، اور اگر کمی کوتاہی رہی تو وہ ملامت اور گالیوں کا نشانہ بنتا ہے۔ مگر اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ انسان نشانہ بننے

اور تنقید کے ڈر سے کچھ لکھنا ہی چھوڑ دے، بلکہ ہمت وحوصلہ اور کوشش جاری رکھنی چاہیے، کیوں کہ محنت وکوشش ذرے کو پروت، چنگاری کو شعلہ اور بے کمال کو باکمال بنادیتی ہے؛ ہر بعید چیز کو قریب کردیتی ہے اور ہر بند دروازے کو کھول دیتی ہے۔امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

فالجد یدنی کل امر شاسع والجد یفتح کل باب مغلق

ترجمہ: کوشش ہر بعید چیز کو قریب کردیتی ہے، اور نصیبہ ہر بند دروازے کو کھول دیتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کے مقدمے میں فرماتے ہیں کہ:
ہر فن شروع میں مشکل نظر آتا ہے اور ایسا خیال گزرتا ہے کہ اس میں قدم رکھنا ناممکن ہے، مگر جب اس فن کی باتوں کو آہستہ آہستہ سمجھنے کی کوشش کی جائے تو وہ قابو میں آجاتا ہے اور اس میں جماؤ حاصل ہوجاتا ہے، کیوں کہ مصائب ومشکلات کا سفر طے کرکے ہی آرزوؤں اور مقاصد تک پہنچا جاسکتا ہے۔لہذا کسی بھی فن میں قدم رکھ کر کوشش جاری رکھنی چاہیے۔انسان جب محنت وکوشش کرتا ہے تو اس کی جدوجہد ضرور رنگ لاتی ہے۔اگر ایک وقت تحریر شکستہ، غیر مرتب، ناقص اور مواد سے خالی ہوتی ہے تو لکھتے لکھتے تحریر میں عمدگی، سلاست اور جلا پیدا ہوجاتی ہے؛ اور پھر تحریر مقبول عام وخاص بن جاتی ہے۔

ہم نے درجہ فارسی اور عربی اول سے عربی پنجم تک ''جامعہ اسلامیہ معارف القرآن اوجھاری ضلع امروہہ'' میں تعلیم حاصل کی، ہمیں لکھنے کا شوق شروع طالب علمی کے زمانے سے ہی رہا ہے، درجہ عربی سوم اور چہارم میں اپنے طور پر کچھ لکھنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔اسی زمانے میں مدرسے میں طلباء کی

تحریری مشق کے لیے ''المعارف'' کے نام سے ماہانہ دیواری پرچہ اور چھ ماہی رسالے کا اجرا ہوا تھا، ادارے کے ایک استاذ مولانا محمد مجتبیٰ قاسمی دربھنگوی نے مضامین لکھنے کے لیے ہمیں خوب ترغیب دلائی، لاشعوری کا زمانہ تھا، کچھ ٹوٹی پھوٹی چھوٹی سی تحریر لکھ لیتے تھے اور مولانا اس کو درست فرمانے کے بعد قابل اشاعت بنادیتے تھے۔ پھر ایک وقت وہ آیا کہ ہمیں ''المعارف'' کا مدیر بنادیا گیا، ہمارے لیے یہ سب نئی چیزیں تھیں، کچھ سمجھ بوجھ نہیں تھی، مولانا نے ہمارے ساتھ بڑی محنت کی اور بہت کچھ سمجھایا، جس سے ہمیں حوصلہ بھی خوب ملا۔ خیر اس لاشعوری کے زمانے میں ہم نے مضامین لکھنے کا طریقہ، اس کی تصحیح، کانٹ چھانٹ، دیواری پرچوں اور رسالوں کے اجرا کا طریقۂ کار اور ان کی ترتیب وغیرہ بہت کچھ دیکھا اور سیکھا۔ درجہ عربی ششم میں ہمارا ''دار العلوم دیوبند'' میں داخلہ ہوا، یہاں طلبۂ ضلع امروہہ کی ''انجمن اعزاز البیان'' کے زیر اہتمام تحریری مشق کے لیے پہلے سے دیواری رسالہ ''الفضل'' کے نام سے موجود تھا، ہم اس سے منسلک ہوئے اور ہر مہینے پابندی کے ساتھ مضامین لکھتے رہے، درجہ عربی ہفتم کے آخر میں مسابقۂ صحافت میں اول پوزیشن حاصل ہوئی، جس سے خوب حوصلہ ملا اور مزید لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ دورۂ حدیث (درجہ عربی ہشتم) میں ہمیں ''الفضل'' کا مدیر بنادیا گیا، جس سے ہمیں بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ اگلے سال (شعبہ تکمیل علوم) ہمیں دوبارہ ''الفضل'' کا مدیر بنادیا گیا، اس سال بھی مسابقۂ صحافت میں اول پوزیشن حاصل ہوئی۔ ماہنامہ ''الفضل'' سے ہم چار سال متعلق رہے اور ہر مہینے پابندی سے مضامین لکھتے رہے۔ ادارت کے دو سال میں بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ اس زمانے میں بہت سے موضوعات پر مضامین لکھے۔

لکھنے کا شوق ہمیں جنون کی حد تک ہوگیا تھا، یہی وجہ ہے کہ دار العلوم دیوبند سے فراغت کے بعد ہم ہمیشہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہے ہیں۔ ایک سال ''مدرسہ شاہی مرادآباد'' کے شعبۂ افتاء میں تعلیم حاصل کی، مفتی محمد سلمان منصور پوری دامت برکاتہم جو شعبے کے استاذ اور نائب مفتی تھے، ہم ان کی بغل میں بیٹھتے تھے، ہر مہینے ان کے نام ملک و بیرون ملک سے بہت سے رسالے آتے تھے، مفتی صاحب ان رسالوں پر سرسری نظر ڈالتے اور ہم بالاستیعاب دیکھتے تھے، وقت نکال کر ان تمام رسالوں کو میں پڑھتا تھا اور کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا تھا۔ ایک دن خوشی اور تعجب کی انتہا نہ رہی جب ایک پاکستانی رسالے میں اپنے ایک مضمون پر میری نظر پڑی، جو کبھی پہلے ''ماہنامہ دار العلوم'' میں شائع ہوا تھا۔ اس سال تعلیمی مصروفیت اتنی تھی کہ اپنی روزمرہ کی ذاتی ضروریات کے لیے بھی وقت تلاش کرنا پڑتا تھا، اس کے باوجود مجھے ہر مہینے رسالوں کا بے صبری سے انتظار رہتا تھا۔ مدرسہ شاہی مرادآباد سے جاری ہونے والا رسالہ ''ندائے شاہی'' جو ہندوستان کا مقبول ماہانہ رسالہ ہے، مفتی محمد سلمان صاحب کی ادارت میں نکلتا تھا، میں اس رسالے کے کاموں پر بھی نظر رکھتا تھا، یعنی کس طرح ہر مہینے پابندی سے کثیر تعداد میں اشاعت کا نظم وانتظام، رسالے کے مضامین اور ان کی ترتیب واسلوب وغیرہ؛ اس طرح نظر رکھنے سے بہت کچھ سیکھنے کو ملتا تھا۔

مجھے سب سے زیادہ پریشانی اور افسوس وقت کے ضائع ہونے سے ہوتا ہے، اسی لیے آج تک ہم خالی وقت میں کچھ نہ کچھ لکھتے پڑھتے رہے ہیں۔ میں نے ہمیشہ اپنے فارغ وقت کو کامیاب بنانے کی بہت کوشش کی ہے، اور شاید کسی حد تک کامیاب بھی ہوا ہوں۔ میں نے اب تک کی زندگی میں بہت سے

موضوعات پر مضامین لکھے، کئی ساری کتابیں مرتب کیں، بہت سے مضامین ماہنامے، رسالے، اخبارات اور انٹرنیٹ پر شائع ہوئے ہیں۔ رفتہ رفتہ مضامین کا بہت سا ذخیرہ تیار ہو گیا تھا، سوچا ان کو کتاب کی شکل میں شائع کر دیا جائے، چناں چہ مضامین کا پہلا مجموعہ ''شعور و آگہی'' کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے، اس میں بہت سے مضامین طالب علمی کے زمانے کے ہیں، لہذا کمی کوتاہیوں کو دیکھ کر تعجب نہ کیا جائے۔ اللہ تعالی ہماری اس چھوٹی سی کاوش کو قبول فرمائے اور اس کتاب کو امت کی رہنمائی کا ذریعہ بنائے۔

محمد قاسم اوجھاری

گناہوں سے سچی توبہ کیجیے!

قرآن کریم میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے: **ولو یؤاخذ الله الناس بظلمهم ما ترک علیها من دابة ولکن یؤخرهم الی اجل مسمی فاذا جاءاجلهم لا یستاخرون ساعة ولا یستقدمون (سورہ نحل)**

ترجمہ: اور اگر اللہ تعالی انسانوں کی ان کے ظلم (گناہ) کی وجہ سے گرفت فرمانے لگے تو روئے زمین پر کوئی جاندار باقی نہیں رہے گا، لیکن وہ انسانوں کو ایک متعینہ مدت تک مہلت دیتا ہے، پس جب ان کا متعینہ وقت آجائے گا، تو وہ ایک گھڑی نہ پیچھے ہٹیں گے اور نہ آگے بڑھیں گے۔

مذکورہ آیت کریمہ میں کہا گیا ہے کہ اگر اللہ تعالی کفر و شرک، ظلم و ناانصافی وغیرہ گناہوں پر لوگوں کی گرفت فرمانے لگے، تو روئے زمین پر کوئی جاندار باقی نہیں رہے گا، بلکہ سب کے سب اپنے گناہوں کے سبب ہلاک ہوجائیں گے؛ انسان اپنے گناہوں کی پاداش میں اور جانور انسانوں کے گناہوں کی نحوست کی وجہ سے۔ لیکن اللہ تعالی فوراً کسی کی پکڑ نہیں کرتے ہیں بلکہ ایک متعین مدت تک مہلت دیتے رہتے ہیں، تاکہ اگر کوئی توبہ کرنا چاہے تو کرسکے، لیکن جب وقت معین آجائے گا، تو پھر کوئی نہیں بچ سکے گا، بلکہ فوراً سزا دی جائے گی۔

آج گناہوں کی کثرت ہے۔ فحاشی وبے حیائی، چوری، ڈکیتی، زنا کاری، ظلم وناانصافی، حق تلفی اور قتل وغارت گری جیسے عظیم گناہ عام ہو چکے ہیں؛ انسان اپنے مقصد تخلیق کو بھولتے جارہے ہیں، دنیا مذہب سے آزادی کی طرف بہت تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے، جس کے نتیجے میں انسانیت اپنا وقار کھو رہی ہے، انسانیت کا سرعام جنازہ نکل رہا ہے اور افسوس صد افسوس اس پر ہے کہ گناہ کو گناہ بھی نہیں سمجھا جارہا ہے، احساس وشعور دل ودماغ سے ختم ہوتا جارہا ہے، خواہشات نفس کی اتباع اپنی انتہا کو پہونچ رہی ہے۔

ایسے حالات میں اس سے پہلے کہ مزید دیر ہو اور ہمارے اعمال کہیں عذاب کی شکل اختیار نہ کرلیں اور توبہ کے دروازے ہم پر بند نہ ہوجائیں، ہمیں گناہوں کے تمام سوراخوں کو فورا بند کردینا چاہیے؛ اللہ تعالی سے سچی پکی توبہ کریں، اپنے احوال درست کریں، عبادات کی پابندی کریں، اپنی زندگیوں میں دین داخل کریں، اپنے گھروں کا دینی ماحول بنائیں، خالق حقیقی کی منشا اور مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کی کوشش کریں، اور بارگاہ ایزدی میں ہاتھ پھیلا کر دعا کریں کہ الہی! ہم پر رحم فرما، نیک اعمال کرنے اور گناہوں سے بچنے کی توفیق عطا فرما، اور جہنم کا ایندھن بننے سے ہماری حفاظت فرما۔

توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوا ہے، اللہ تعالی توبہ کرنے والوں کو بہت پسند فرماتے ہیں، اللہ کی شان سے بعید ہے کہ کوئی بندہ اس کے سامنے سچے دل سے توبہ کرے اور وہ اس کی توبہ قبول نہ کرے۔ لہذا ہمیں ہر وقت اللہ کے حضور توبہ واستغفار کرتے رہنا چاہیے، تاکہ دونوں جہاں کی کامیابی ہمارا مقدر ہو۔

قتل ناحق سے بچیے!

امام بخاری اور مسلم رحمہا اللہ نے ایک روایت نقل کی ہے: **عن عبد الله بن مسعود رضي الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: اول ما يقضى بين الناس يوم القيامة الدماء (متفق عليه مشكاة المصابيح ۲۹۹)**

ترجمہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قیامت کے دن لوگوں کے درمیان سب سے پہلے جس چیز کا فیصلہ کیا جائے گا، وہ خون ناحق ہے۔

مذکورہ حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خون ناحق سے دور رہنے کی نصیحت فرمائی ہے۔ عام طور پر قتل ناحق کی تین شکلیں ہیں۔

(۱) انسان ناحق طور پر کسی کا قتل کر دے، خواہ خود کرے یا کسی دوسرے سے کرائے: اس کا رواج آج کل بہت بڑھ گیا ہے، چھوٹی چھوٹی باتوں پر قتل و غارت گری کے واقعات روز بروز پیش آ رہے ہیں۔ جدید آلات وایجادات اور نئی ٹیکنالوجی نے اس کو مزید آسان کر دیا ہے، گویا کہ آج کے زمانے میں قتل و غارت گری ایک کھیل بن چکا ہے۔

(۲) خودکشی: جو آج کی نوجوان نسل میں بہت تیزی کے ساتھ عام ہوتی جارہی ہے۔ والدین سے اختلاف یا مالی تنگیوں اور کاروباری الجھنوں کی وجہ سے یا بعض دیگر وجوہات کی بنا پر انسان حرام موت گلے لگا لیتا ہے، کبھی گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لیتا ہے، کبھی کوئی دوسرا طریقہ اپنا کر اپنی جان دے دیتا ہے، اور یہ سمجھتا ہے کہ دنیا کی الجھنوں، ناکامیوں اور ذلتوں سے بچنے کا اس

سے بہتر کوئی راستہ نہیں ہے؛ حالاں کہ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ خودکشی راحت اور چین وسکون کا ذریعہ نہیں، بلکہ تباہی اور ہمیشہ کی ہلاکت کا سبب ہے۔

(۳) قتل اولاد: یعنی بلا کسی شرعی عذر اسقاط حمل کرا کر ایک جان کو ضائع کر دینا۔ اس کا رواج آج بہت بڑھتا جا رہا ہے، نوجوان جوڑے ''اسقاط حمل'' اور ''برتھ کنٹرول'' میں اس درجے تک پہنچ چکے ہیں کہ اگر نہ چاہتے ہوئے بھی محض تقدیر الٰہی سے نئے مہمان کی آمد کی خبر ملتی ہے، تو فوراً اس کا اسقاط کرا دیتے ہیں؛ یاد رکھیں! برتھ کنٹرول، جنین کشی اور اسقاط حمل اگر شرعی عذر کے بغیر کرایا جائے، تو ماں باپ کو قتل ناحق کا مجرم قرار دیا جائے گا۔

یہ تینوں شکلیں قتل ناحق میں شامل ہیں، آج معاشرے میں ان تینوں شکلوں کا سلسلہ بہت تیزی کے ساتھ بڑھتا جا رہا ہے۔ یاد رکھیں! قیامت کے دن جب حقوق العباد کا سلسلہ شروع ہوگا، تو سب سے پہلے خون ناحق کا فیصلہ ہوگا؛ اگر ہمارے ہاتھ خون ناحق کی چھینٹوں سے پاک وصاف ہوں گے، تو رب ذوالجلال ہمارے گناہوں کو معاف کر کے رحمت ومغفرت کے دروازے ہم پر کھول دے گا؛ اور اگر ہمارے ہاتھ خون ناحق سے رنگین ہوئے، تو رب کائنات کی رحمت ومغفرت سے ہم محروم ہو جائیں گے۔ قرآن وحدیث میں قتل ناحق پر بہت سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں، اور اس کے مرتکب کے لیے دنیا وآخرت میں سخت سزاؤں کا اعلان کیا گیا ہے۔ ہمیں اس عظیم گناہ سے بچنا ضروری ہے، تاکہ تباہی وبربادی ہمارا مقدر نہ ہو۔

آخرت کی تیاری اوراس کی فکر کیجیے!

قرآن کریم میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے: **قل اؤ نبئکم بخیر من ذلکم للذین اتقوا عند ربھم جنات تجري من تحتھا الانھار خلدین فیھا و ازواج مطھرۃ ورضوان من اللہ واللہ بصیر بالعباد** (سورہ آل عمران)

ترجمہ: آپ (لوگوں سے) کہہ دیجیے! کیا میں تم کو ان سے بہتر چیزیں بتاؤں؟ (سنو) جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں ان کے لیے ان کے رب کے پاس ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ جنت میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، اور پاکیزہ جوڑے ہیں اور اللہ کی خوشنودی ہے، اور اللہ اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہے۔

دنیا میں اللہ تعالی نے انسانوں کو امتحان اور آزمائش کے لیے بھیجا ہے، دنیا کی زندگی عارضی زندگی ہے، اصل زندگی آخرت کی ہے؛ اسی لیے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ آخرت کے احوال سے باخبر کرتے رہے، تاکہ لوگ آخرت کی تیاری اور اس کی فکر میں مصروف رہیں۔ لیکن آج ہم دنیا کی محبت میں اتنے گرفتار ہو چکے ہیں کہ ہم نے آخرت کو بالکل بھلا ہی دیا ہے، ٹھیک ہے اللہ تعالی نے ہمیں دنیا میں نعمتیں دے رکھی ہیں، لیکن دنیا کی نعمتیں فانی ہیں، سب ختم ہو جائیں گی اور آخرت کی نعمتیں ہمیشہ ہمیش رہیں گی، کبھی ختم نہیں ہوں گی۔

مذکورہ آیت کریمہ میں اللہ تعالی فرما رہا ہے کہ اے نبی: جو لوگ دنیا کی ناقص اور فانی نعمتوں میں مست ہو گئے ہیں، ان سے کہہ دو کہ میں تم کو ان سے

بہتر بہتر نعمتوں کا پتہ دیتا ہوں؛ سنو! جو لوگ اللہ سے ڈرنے والے اور اس کے فرماں بردار ہیں، ان کو آخرت میں ایسے سرسبز وشاداب باغات ملیں گے، جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی؛ اور پاک وصاف جوڑے ملیں گے۔ دوسری جگہ فرمایا کہ اہل جنت کو ہر وہ چیز ملے گی، جس کی وہ تمنا کریں گے، اور جنت کی نعمتیں کبھی ختم ہونے والی نہیں ہیں، بلکہ ہمیشہ ہمیش رہیں گی؛ اور سب سے بڑی نعمت جو عطا کی جائے گی، وہ اللہ تعالی کی دائمی رضا اور خوشنودی ہے۔

حدیث میں ہے کہ جب سب اہل جنت جنت میں پہنچ کر مسرور و مطمئن ہو چکے ہوں گے اور کوئی تمنا باقی نہیں رہے گی جو پوری نہ کردی گئی ہو، تو اس وقت اللہ تعالی اہل جنت کو خطاب کر کے فرمائیں گے کہ: اب تم راضی اور مطمئن ہو؟ کسی اور چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟ وہ عرض کریں گے کہ اے پروردگار: آپ نے ہمیں جو نعمتیں عطا کی ہیں، ان سے بڑی کیا نعمتیں ہوں گی؛ حق تعالی فرمائیں گے کہ: اب میں تم کو سب نعمتوں سے بالاتر ایک نعمت اور دیتا ہوں، وہ یہ ہے کہ تم کو میری رضا اور قرب دائمی طور پر حاصل ہے، اب ناراضگی کا کوئی خطرہ نہیں۔ (جامع ترمذی، رقم ۲۵۶۴)

لہذا ہمیں دنیا کی فانی نعمتوں میں مست ہو کر آخرت کو نہیں بھولنا چاہیے، ہر وقت آخرت کی تیاری اور اس کی فکر کرتے رہنا چاہیے، تاکہ ہم اللہ تعالی کی بڑی بڑی اور دائمی نعمتوں سے مالا مال ہوں، اور اللہ کی دائمی رضا اور قرب نصیب ہو؛ اللہ تعالی ہم سب کو آخرت کی فکر اور اس کی تیاری کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

یہ دنیا آزمائش کی جگہ ہے

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روایت نقل کی ہے: **عن ابي سعيد الخدري رضي الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الدنيا حلوة خضرة وان الله مستخلفكم فيها فينظر كيف تعملون فاتقوا الدنيا واتقوا النساء فان اول فتنة بني اسرائيل كانت في النساء** (رواه مسلم، مشكاة المصابيح ۲۶۷)

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: دنیا (بظاہر) بڑی مزے دار اور خوبصورت ہے، اور اللہ تعالی نے تمہیں اس میں اپنا خلیفہ بنایا ہے، تو وہ تمہارے اعمال کو دیکھے گا؛ لہذا تم دنیا سے بچو، اور عورتوں کے (فتنے) سے بچو، کیوں کہ بنی اسرائیل سب سے پہلے عورتوں کے فتنے میں ہی مبتلا ہوئے تھے۔

مذکورہ حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چار چیزوں کی طرف توجہ دلائی ہے، اور یہ چار باتیں اتنی اہم اور ضروری ہیں کہ ان کے بغیر دنیا اور آخرت کی کامیابی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

(۱) **الدنیا حلوۃ خضرۃ**: یہ دنیا بظاہر بڑی مزے دار ہے، بڑی اچھی لگتی ہے، اس کی ظاہری چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے اور دلوں کو لبھاتی

ہے؛لیکن یہاں کسی بھی چیز کو دوام نہیں ہے، ہر چیز فنا اور ختم ہونے والی ہے۔لہذا اے لوگو!تم دنیا کی ظاہری چمک دمک اور اس کی لذتوں سے دھوکہ کھا کر اس کی محبت میں گرفتار مت ہوجانا۔

(۲)**ان اللہ مستخلفکم فیھا الخ**: دنیا کے اندر جتنی بھی چیزیں ہیں، ہر چیز کا مالک اللہ تعالی ہے، انسان کسی بھی چیز کا مالک نہیں ہے، حتی کہ اپنی جان کا بھی نہیں؛ ہاں اللہ تعالی نے انسانوں کو اپنا نائب اور خلیفہ بنایا ہے اور دنیا کی چیزوں کو استعمال کرنے کا اختیار دیا ہے، اور اس سے وہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ تم میں کس کے اعمال سب سے زیادہ اچھے ہیں۔لہذا اے لوگو!تم اللہ کی منشا و مرضی اور اس کے حکم کے مطابق زندگی گزارنے کی کوشش کرو۔

(۳)**اتقوا الدنیا**: اے لوگو!تم دنیا سے بچو، کیونکہ دنیا کی محبت جب دلوں میں گھر کر جاتی ہے، تو انسان کو دھوکا دینے، جھوٹ بولنے، چوری کرنے، زنا کرنے، قتل کرنے، ظلم اور حق تلفی کرنے جیسے عظیم گناہوں میں کوئی تکلف نہیں رہتا؛ اور رفتہ رفتہ کبیرہ گناہوں کی برائی بھی اس کے دل و دماغ سے ختم ہوتی جاتی ہے، جس کے نتیجے میں دنیا اور آخرت کی بربادیوں کی داستان شروع ہوجاتی ہے؛ اس لیے اے لوگو!تم دنیا سے ہمیشہ بچتے رہو۔

(۴)**اتقوا النساء الخ**: اے لوگو!عورتوں کے فتنے سے بچو۔آج کل عورتوں کا فتنہ بڑے سر چڑھ کر بول رہا ہے، بے پردگی و بے حیائی اور مرد و زن کے بے محابا اختلاط کو ترقی کی معراج سمجھا جا رہا ہے، ہر طرح کی بدکاری اور جنسی آوارگی عام ہو رہی ہے، جس کی وجہ سے عزتیں نیلام ہو رہی ہیں، اختلاف لڑائی جھگڑے اور قتل و قتال جیسے واقعات میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے؛ آپ صلی

اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: عورتوں کے فتنے سے بھی بچو، کیوں کہ بنی اسرائیل سب سے پہلے جس فتنے میں مبتلا ہوئے تھے، وہ عورتوں کا ہی فتنہ تھا، جس کی وجہ سے پوری قوم عذاب الٰہی کا شکار ہوئی تھی۔

اگر ہم دنیا اور آخرت میں کامیابی چاہتے ہیں، تو مذکورہ باتوں پر عمل کرنا ضروری ہے، اللہ تعالی ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے اور دین اسلام پر استقامت نصیب فرمائے۔ آمین

مسلمانوں کے عروج وزوال کے اسباب

بڑی نزاکتوں کا حامل موضوع ہے، لکھنے والوں نے بہت کچھ لکھا ہے، مفکرین ومدبرین اور تجزیہ نگاروں نے اپنے اپنے زاویۂ فکر سے اس پر روشنی ڈالی ہے اور ہر ایک نے اپنے نقطۂ نظر سے اس کے اسباب ووجوہات اور حل پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

تاریخی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مسلمانوں میں اتحاد واتفاق تھا، ہم آہنگی اور یکجہتی کا سرمایہ موجود تھا، ملت اسلامیہ اختلاف وانتشار سے دور تھی، مسلم معاشرے میں تعصب وعناد اور گروہی عصبیت کی کوئی گنجائش نہیں تھی، پورا معاشرہ اتحاد واتفاق کا حسین سنگم تھا، قرآن وسنت پر مضبوطی سے عمل تھا، گناہوں سے سخت نفرت تھی، اس وقت مسلمان ترقی کی راہوں پر گامزن تھا، حکومت وسلطنت مسلمانوں کے قدموں میں تھی، تخت وتاج پر مسلمانوں کا راج تھا، دریاؤں اور سمندروں پر مسلمانوں کی حکمرانی تھی؛ مسلمانوں کے قدم بڑھے تو بڑھتے چلے گئے، غار حرا سے طلوع ہونے والا سورج پورے عالم پر محیط ہوتا چلا گیا۔

مسلمانوں کے پاس آسمانی کتاب اور شریعت الٰہیہ تھی، اس لیے ان کو کسی بھی معاملے میں قیاس اور اپنی طرف سے قانون سازی کی ادنی سی بھی ضرورت نہیں تھی؛ وہ جہالت وناواقفیت، روز بروز کے قانونی ردوبدل، ترمیم،

ہولناک غلطیوں اور مظالم سے محفوظ تھے؛ وہ اپنی سیاست و معاملات میں پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے، وہاں نہ روحانیت و مادیت میں کش مکش تھی، نہ دین وسیاست میں کوئی تصادم، نہ اغراض واخلاق کے درمیان کوئی مزاحمت تھی، نہ طبقوں اور گروہوں کی باہمی رنجش اور جنگ؛ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت مسلمانوں کا مقابلہ نہ کرسکی، اسلام پھیلا تو پھیلتا چلا گیا۔ اقبال مرحوم کہتے ہیں:

مغرب کی وادیوں میں گونجی اذاں ہماری
تھمتا نہ تھا کسی سے سیل رواں ہمارا

پھر جب مسلمانوں میں باہمی خانہ جنگی شروع ہوئی، صفوں سے اتحاد واتفاق ختم ہوا، فرقہ بندی معاشرے کا جز بن گئی، گناہوں کی کثرت ہوئی، قرآن وسنت کو پس پشت ڈال دیا گیا، تو پھر یہی عروج زوال میں بدلنے لگا؛ یہ حقیقت ہے کہ اختلاف کے کیڑوں اور منافقت وغداری نے مغلوں کا تخت وتاج پلٹا ہے، انتشار کی دیمک نے اندلس سے اسلام کی بنیاد گرائی ہے، باہمی رنجش نے سلطنت تیموریہ کو تہہ وبالا کیا ہے؛ پھر جب یہ صورت حال مزید بڑھی، اور مسلمان اس شعر کا مصداق ہوئے:

کیا ہوا گر قوم پر غیروں کی یلغاریں ہوئیں
ہم تو اپنے آشیانے میں بہت محفوظ ہیں

تو پھر سلطنت عثمانیہ کا خاتمہ ہوا، اسلامی طاقت وقوت کو توڑ دیا گیا، عالم اسلام کو بے دست و پا کر دیا گیا، عراق کی دھجیاں اڑا دی گئیں، افغانستان کو بھوکا ننگا کر دیا گیا، شام کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے، فلسطین کو لہولہان کر دیا گیا، لیبیا پر نزع کی کیفیت طاری کر دی گئی، لبنان کی خوبصورتی کو گہن لگ گیا، یمن کی برکتیں

لوٹ لی گئیں؛ اور جب عیاشیاں عام ہوئیں تو عالم عربی میں یہودیوں کے چینل اور اسٹیشن قائم ہوئے، جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اہل مغرب نے مسلمانوں کو اپنے چنگل میں لینے اور مسلم معاشرے کو تباہ کرنے کے لیے ذرائع ابلاغ کا سہارا لے کر فحاشی و بے حیائی کا جال بچھا دیا؛ دنیا یہ منظر نامہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے۔

مختصر یہ کہ آپسی اتحاد و اتفاق، اختلاف و انتشار سے دوری، فرقہ بندی اور تعصب و عناد کا خاتمہ، دین و سیاست میں یکجہتی، روحانیت و مادیت میں یکسانیت اور قرآن وسنت پر مضبوطی سے عمل مسلمانوں کے عروج کے اسباب ہیں؛ اور اتحاد و اتفاق کا فقدان، اختلافات و انتشار، باہمی رنجش، فرقہ بندی، گروہی عصبیت، تعصب و عناد، دین و سیاست میں تصادم، روحانیت و مادیت میں کشمکش، اغراض و اخلاق میں مزاحمت اور قرآن وسنت سے دوری مسلمانوں کے زوال کے اسباب ہیں۔

آخر میں اس تحریر کو حضرت شیخ محمد زکریا رحمہ اللہ کی کتاب ''الاعتدال فی مراتب الرجال'' کے ایک اقتباس پر ختم کرتے ہیں، جو مسلمانوں کے لیے بہترین لائحۂ عمل ہے اور جس میں مسلمانوں کی فلاح و ترقی کا راز مضمر ہے۔ مولانا لکھتے ہیں: یہ نہیں ہوسکتا کہ مسلمان مسلمان رہ کر گناہوں کی کثرت کے ساتھ ترقی کرتا رہے، مسلمانوں کی ترقی کا معیار صرف دین پر عمل ہے، بالخصوص گناہوں سے بچنا۔ دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ: مسلمانوں کی کامیابی صرف اتباع مذہب، اسوۂ رسول اور سلف صالحین کے طریقے میں منحصر ہے، مسلمانوں کی ترقی اور فلاح کا واحد راستہ گناہوں سے بچنا ہے اور اسلامیات کا اہتمام ہے۔

ثنا خان کو نئی زندگی مبارک ہو!

اللہ تعالی نے نفس انسانی میں فجور اور تقوی دونوں کا الہام کیا ہے، یعنی نفس انسانی کی تخلیق میں حق تعالیٰ نے گناہ اور طاعت دونوں کے مادے اور استعداد رکھی ہے، پھر انسان کو ایک خاص قسم کا اختیار اور قدرت دی ہے کہ وہ اپنے اس قصد واختیار سے گناہ کے راستے پر چلے یا طاعت کا راستہ اختیار کرے، جب وہ اپنے قصد و اختیار سے جس راستے پر چلے گا، اسی اعتبار سے اس پر اجر مرتب ہوگا؛ یعنی اگر طاعت والا راستہ اختیار کرے گا تو دنیا اور آخرت دونوں میں کامیاب ہوگا، اور اگر گناہ والا راستہ اختیار کرے گا تو دونوں جہاں میں ناکام اور نامراد ہوگا اور اس کا برا ٹھکانہ ہوگا۔حق تعالی نے اسی کو قرآن کریم کی ان آیات میں بیان کیا ہے: **فالھمھا فجورھا وتقوھا قد افلح من زکھا وقد خاب من دسھا** (سورہ شمس)

انسان گناہ اور غلطیوں سے معصوم نہیں ہے، انسان سے گناہوں کا صدور ممکن ہے، لیکن اس کے بعد اصل چیز توبہ ہے، گناہ سرزد ہوجانے کے بعد اگر توبہ نہیں کرتا ہے تو وہ خسارے میں ہے، اور اگر توبہ واستغفار کر لیتا ہے تو عین ممکن ہے کہ اللہ تعالی اس کو معاف فرما دیں؛ اللہ تعالی کی ایک صفت ''تواب'' ہے، یعنی وہ توبہ کو قبول فرماتے ہیں اور توبہ کرنے والے کو بے حد پسند فرماتے

ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن وحدیث میں توبہ کرنے پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے، اگر سراپا گناہوں میں ڈوبا ہوا انسان اللہ کے سامنے سچے دل سے توبہ کرے اور ندامت کے آنسو بہاتے ہوئے کہے کہ اے اللہ: میں اپنے کیے ہوئے گناہوں پر بہت زیادہ شرمندہ ہوں، آپ مجھے معاف فرمادیں، میں آئندہ گناہ نہ کرنے کا وعدہ کرتا ہوں، میں گناہوں سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا اور آپ کی مرضی کے مطابق زندگی گزاروں گا۔۔۔ خدا تعالی اس بندے کی توبہ کو ضرور قبول فرمائیں گے اور ضرور اس بندے کو معاف فرمائیں گے، یہ اللہ کا وعدہ ہے؛ اس کی شان سے بعید ہے کہ کوئی گناہ گار اس کے سامنے سچے دل سے توبہ کرے اور وہ اُسے معاف نہ کرے۔

توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوا ہے، انسان کسی بھی حالت اور کسی بھی وقت میں اللہ کے سامنے توبہ کر سکتا ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ اس وقت تک قبول کرتا ہے جب تک آخری وقت میں غرغرہ نہ لگ جائے۔ (ترمذی: ۳۵۳۷، ابن ماجہ ۲۲۵۳)

توبہ کرنے کے بعد آدمی پاک وصاف ہو جاتا ہے، اس کو پاکیزگی نصیب ہوتی ہے، اور ایسا ہو جاتا ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں؛ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہو جاتا ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہ ہو۔ (ابن ماجہ ٤٢٥٠)

توبہ غسل کی طرح ہے، جتنی مرتبہ کی جائے ہر مرتبہ روح اور نفس میں پاکیزگی اور نکھار پیدا ہوتا ہے، دل کی کیفیت بدلتی ہے، معرفت خداوندی کے دروازے کھلتے ہیں اور عشق الٰہی کی دولت نصیب ہوتی ہے؛ جوانی میں ہر چیز

اپنے شباب پر ہوتی ہے، جوانی میں توبہ اللہ کو بہت پسند ہے، جب کوئی جوان آدمی اللہ کے سامنے روتا ہے اور سچے دل سے توبہ واستغفار کرتا ہے تو رحمت الٰہی جوش میں آتی ہے، اس پر خاص نظر کرم کرتی ہے، اور اس کو اپنا محبوب ومقرب بندہ بنالیتی ہے، پھر ساری کائنات اس سے محبت کرنے لگتی ہے۔

سوشل میڈیا کے ذریعے معلوم ہوا کہ معروف بالی ووڈ اداکارہ ''ثنا خان'' نے موت کے بعد والی زندگی کی خاطر فلم انڈسٹری کو چھوڑ دیا ہے اور اپنی سابقہ زندگی سے توبہ کرلی ہے، انہوں نے اپنے سماجی رابطوں کی ویب سائٹ کے ذریعے اس کی اطلاع دی ہے؛ ایک لمبی تحریر میں انہوں نے لکھا ہے کہ: ''کیا انسان کو یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ اسے کسی بھی وقت موت آسکتی ہے؟ اور مرنے کے بعد اس کا کیا بننے والا ہے؟ اس سوال کا جواب میں نے اپنے مذہب میں تلاش کیا، تو مجھے پتا چلا کہ کہ دنیا کی یہ زندگی اصل میں مرنے کے بعد کی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے ہے اور وہ اسی صورت میں بہتر ہوگی جب بندہ اپنے پیدا کرنے والے کے حکم کے مطابق زندگی گزارے اور صرف دولت وشہرت کو اپنا مقصد نہ بنائے، بلکہ گناہ کی زندگی سے بچ کر انسانیت کی خدمت کرے اور اپنے پیدا کرنے والے کے بتائے ہوئے طریقے پر چلے؛ اس لیے میں آج یہ اعلان کرتی ہوں کہ آج سے میں اپنے شوبز (فلم انڈسٹری) کی زندگی چھوڑ کر انسانیت کی خدمت اور اپنے پیدا کرنے والے کے حکم پر چلنے کا پکّا ارادہ کرتی ہوں''۔

انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ: ''تمام بہنوں اور بھائیوں سے التجا ہے کہ وہ میرے لیے اللہ سے دعا کریں کہ وہ میری توبہ قبول فرمائے اور مجھے اپنے خالق کے احکام اور انسانیت کی خدمت میں گذارنے کے اپنے عزم کے مطابق زندگی

گزارنے کی حقیقی صلاحیت عطا فرمائے اور مجھے استقامت عطا کرے''۔

آخر میں انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ: ''تمام بھائیوں اور بہنوں سے گزارش ہے کہ وہ ''شوبز'' کے کسی بھی کام کے سلسلے میں مجھ سے مشورہ نہ کریں''

یہ حقیقت ہے کہ اس دنیا کا سب سے گھناؤنا اور ناپاک چہرہ ''فلم انڈسٹری'' ہے، اس کی ابتدائی بنیادیں چاہے کتنی ہی حسین اور مہذب نظر آتی ہوں، لیکن حالات اور مشاہدات نے ثابت کر دیا کہ فلم انڈسٹری کا حقیقی قیام جنسی آوارگی کا فروغ اور تہذیب کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے ہوا ہے، چناں چہ ٹی وی سیریل، ہالی ووڈ اور بالی ووڈ وغیرہ کے فلمی ڈراموں اور گانوں نے جتنا انسانی معاشرے کو تباہ کیا ہے، اتنا کسی نے نہیں کیا؛ ان بے حیا اور فحش مناظر نے انسانی ذہنوں پر ایک عجیب کیفیت مسلط کر دی ہے، غیر محسوس طریقے پر انسانی معاشرے کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کر دیا ہے، تہذیب کا نام ونشان تو درکنار بدتہذیبی اور جنسی آوارگی کا دن بدن ایسا سیلاب آ رہا ہے، جو رکنے کا نام نہیں لے رہا ہے؛ یہ سب اسی ''فلمی انڈسٹری'' کی دین ہے۔ معاشرے کو مزید تباہی اور بربادی سے بچانے کے لیے فحاشی و بے حیائی اور جنسی انارکی کے اس اڈے پر لگام کسنے کی ضرورت ہے۔

محترمہ ثنا خان نے اپنی سابقہ زندگی (فلم انڈسٹری) سے توبہ کرتے ہوئے اپنی بقیہ زندگی خالق کی اطاعت، مذہب اور انسانیت کی خدمت کے لیے گزارنے کا عزم کیا ہے؛ یہاں سے ان کی نئی زندگی کی شروعات ہوتی ہے، ان کو نئی زندگی مبارک ہو۔ بہت ہی ہمت کی بات ہے کہ کوئی شخص عزت، دولت، شہرت اور دنیا کی چکا چوند کو چھوڑ کر اپنی زندگی خالق کی اطاعت، تقوی، پاکیزگی،

پرہیزگاری، مذہب اور انسانیت کی خدمت کے لیے گزارے؛ یقیناً اس میں اس نوجوان نسل کے لیے عبرت ونصیحت کا پیغام ہے، جو فلم انڈسٹری کی چکا چوند میں اندھے اور بہرے ہوئے جارہے ہیں اور اپنی زندگیوں کو تباہ کررہے ہیں۔

خدا تعالی ثنا خان کی توبہ کو قبول فرمائے اور بقیہ زندگی جس طرح گزارنے کا انہوں نے عزم کیا ہے اور جن پاکیزہ جذبات وخیالات کا اظہار کیا ہے، اس میں استقامت نصیب فرمائے؛ اللہ تعالی ہم سب کے گناہوں کو معاف فرمائے، گناہوں سے بچنے اور مرنے کے بعد کی زندگی (آخرت) کو بہتر بنانے کی توفیق عطا فرمائے؛ بے شک وہ توبہ قبول کرنے والا، گناہ گاروں کو معاف کرنے والا اور مہربانوں کا مہربان ہے۔

قلم انسان کو ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیتا ہے

اپنی بات کو دوسروں تک پہنچانے کے دو طریقے ہیں، زبان اور قلم؛ زبان اور قلم کی ضرورت ہر زمانے میں رہی ہے اور اس دور میں کچھ زیادہ ہی ہے، کیوں کہ آج کا دور الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا کا دور ہے، تقریر وتحریر اپنے عروج پر ہے؛ زبان وقلم رب کائنات کی ان عظیم نعمتوں میں سے ہیں جو اس نے انسانی نفوس میں ودیعت فرمائی ہیں، یہ قلمی ولسانی نعمت وہ ہے جس کے ذریعے ماضی میں انقلاب آیا اور آج کے بگڑے ہوئے حالات میں بھی اس سے نکھار لایا جاسکتا ہے۔

آج تاریخ کی بہت سی وہ شخصیات جن کا تذکرہ ہم اپنی محفلوں اور مجلسوں میں کرتے رہتے ہیں، وہ قلم ہی کی وجہ سے ہمارے درمیان زندہ ہیں، وہ اپنی تصنیفات وتالیفات ہی کی وجہ سے ہمارے درمیان موجود ہیں؛ ان کے زندۂ وجاوید رہنے میں قلم کو خاصی اہمیت حاصل ہے، قلم ہی کی وجہ ہے کہ آج تک دنیا ان کے علوم ومعارف سے مستفید ہو رہی ہے اور ہمیشہ ہوتی رہے گی۔

رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوق

اولاد سے تو ہے یہی دو پشت چار پشت

زبان سے مخاطب کو وقتی طور پر مطمئن کیا جاتا ہے، جبکہ قلم سے نکلنے

والے انمول موتی عرصۂ دراز تک افادہ اور استفادے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قلم کی اہمیت بمقابلہ زبان ہر زمانے میں زیادہ رہی ہے اور آج کے دور میں کچھ زیادہ ہی ہے، کیوں کہ بیان وخطابت تو صرف وعظ ونصیحت کے دائرے میں گھرتا جارہا ہے، جب کہ موجودہ زمانے میں اپنی بات خواص وعوام میں منوانے کے لیے تحریری ثبوت از حد ضروری ہے، اس لیے تحریر سیکھنا اور قلم میں مہارت حاصل کرنا زمانے کی ضرورت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: سب سے پہلے اللہ نے قلم کو پیدا کیا اور اسے حکم دیا تو اس نے ہر چیز کو لکھ دیا۔ (مسند ابی یعلی، رقم ۲۳۲۹) اللہ کی نازل کی ہوئی کتابیں سب قلم ہی کے ذریعے لکھی گئیں اور رہتی دنیا تک باقی رہیں گی، اگر قلم نہ ہوتا تو دین ودنیا کے سارے ہی کام مختل ہوجاتے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ قلم اللہ کی بڑی نعمت ہے، اگر یہ نہ ہوتا تو نہ کوئی دین قائم رہتا اور نہ دنیا کے کاروبار درست ہوتے۔

علمائے سلف وخلف نے ہمیشہ تحریر کا بہت اہتمام کیا ہے، جس پر ان کی تصانیف کے عظیم الشان ذخائر آج تک شاہد ہیں؛ مگر افسوس! آج کے دور میں قلم کی اہمیت سے صرف نظر کرنے کا رواج عام ہوگیا ہے، اور اس کی بہت سی تاویلات سامنے آتی ہیں، جس کا ماحول پر برا اثر مرتب ہوتا ہے، جس کی بنا پر اس زہریلے ماحول میں طالبین بھی اس میدان میں آگے نہیں بڑھتے اور اپنا مستقبل خوب تابناک نہیں بنا پاتے، اپنے اندر افادہ اور استفادے کا ملکہ بہم پہنچانے سے قاصر رہتے ہیں، اس لیے وہ اس پوزیشن میں نہیں ہوتے کہ بین المذاہب اور بین الاقوامی پیش آمدہ مسائل کا بخوبی حل کرسکیں اور نت نئے فتنوں

کا مقابلہ کر سکیں۔

لہذا ضروری ہے کہ قلم کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اپنے اندر قلمی استعداد و صلاحیت پیدا کرنے کی خوب کوشش کی جائے، تا کہ پیش آمدہ مسائل کو صحیح انداز میں حل کیا جا سکے اور تبلیغ دین کا کام بخوبی انجام دیا جا سکے۔

مالی چلا گیا ہے تو گلستاں اداس ہے

(مولانا حسن الہاشمی کی وفات)

مشہور ومعروف جگہ ''دیوبند'' کی مایۂ ناز شخصیت حضرت مولانا حسن الہاشمی صاحب ۴؍نومبر ۲۰۲۰ء بروز بدھ بوقت عشاء اس دار فانی سے دار بقاء کی طرف رحلت فرما گئے۔ وفات کی خبر سن کر بہت دکھ ہوا، اور یقین نہیں ہو رہا ہے کہ مولانا ہمارے درمیان سے چلے گئے ہیں۔ مولانا کی پیدائش ۱۹۴۹ء میں ہوئی اور انہوں نے اپنی تعلیم ''دارالعلوم دیوبند'' میں مکمل کی، تعلیم سے فراغت کے بعد کئی سال درس وتدریس میں لگے رہے، پھر مختلف میدانوں میں کام کیا، اور اپنی خدمات کی بنا پر ملکی اور عالمی سطح پر مشہور ہوئے۔

دارالعلوم دیوبند میں طالب علمی کے قیام کے دوران بہت مرتبہ مولانا کے پاس جانا ہوا اور میں نے مولانا کو بہت قریب سے دیکھا ہے؛ وہ انتہائی ملنسار، خوش اخلاق اور نمایاں صفات کے مالک تھے؛ ہر ایک سے بڑی پیار و محبت کے ساتھ ملتے تھے، طلبہ کا بڑا احترام کرتے تھے، اللہ نے ان کو حسن سیرت اور حسن صورت دونوں سے نوازا تھا؛ وہ عالم دین ہونے کے ساتھ بہترین جسمانی و روحانی معالج بھی تھے، جب بھی ان کے پاس جانا ہوا تو جسمانی

وروحانی مریض اورضرورت مندلوگوں کا ان کے پاس ہجوم لگا رہتا تھا، اللہ نے ان کے ہاتھ میں شفا رکھی تھی؛ دیو بند میں ''خدمت خلق'' کے نام سے ادارہ چلاتے تھے۔ مجھے یاد ہے میں ایک مرتبہ ان کے پاس اپنی ضرورت سے بیٹھا ہوا تھا، وہ فرما رہے تھے کہ میں صرف قرآن اور حدیث سے علاج کرتا ہوں، اور میں نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا بھی علاج کیا ہے، اسی طرح فدائے ملت مولانا اسعد مدنی کا بھی میں نے علاج کیا ہے اور دیو بند کی تقریباً پانچ ہزار عورتیں جن کے بچے پیدا نہیں ہورہے تھے، میرے تعویذ ان کی شفا کا سبب بنے ہیں۔

وہ درجنوں کتابوں کے مصنف بھی تھے اور ماہنامہ ''طلسماتی دنیا'' کے مدیر تھے؛ تقریبا پانچ سال وہ مولانا عامر عثمانی کے مشہور زمانہ ماہنامہ ''تجلی'' کے بھی مدیر رہے۔ اس کے علاوہ بہت سے ماہنامے اور اخبارات میں مضامین لکھتے تھے، اور سیاسی امور پر بھی اپنی رائے رکھتے تھے؛ ساتھ ہی وہ بہترین شاعر بھی تھے اور سماجی شخصیت بھی تھے، انہوں نے قومی وملی خدمات بھی بخوبی انجام دی ہیں، ان کے کمرے میں بہت سے ایوارڈ اور اعزازات رکھے تھے، جو ان کی قومی وملی خدمات کی بنا پر ملے تھے۔

اب کبھی دیو بند مولانا کے یہاں جانا ہوگا تو مولانا نظر نہیں آئیں گے، وہ لمحات ہمارے لیے بڑے تکلیف دہ ہوں گے؛ لیکن تقدیر کے نظام کو کیا کہیے! دنیا میں کسی بھی چیز کو دوام نہیں ہے، ہر چیز فنا ہونے والی ہے، **كل من عليها فان، ويبقى وجه ربك ذو الجلال والاكرام** (سورہ رحمن) ہر چیز فنا ہو جائے گی، بس اللہ کی ذات باقی رہے گی، جو بزرگی اور عظمت والا ہے۔ مولانا ہمارے درمیان سے چلے گئے ہیں، لیکن ان کی محبتیں اور عنایات ہمیشہ ہمارے

ساتھ رہیں گی؛ دکھ کی اس گھڑی میں تمام ہی عزیز واقارب، اہل خانہ، خصوصا حضرت کے صاحبزادے بھائی وقاص احمد کی خدمت میں تعزیت مسنونہ پیش ہے۔ اللہ تعالی مولانا کو غریق رحمت فرمائے، بال بال مغفرت فرمائے، جنت الفردوس میں اعلی مقام عطا فرمائے، پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

امریکہ کے نئے صدر؛ جوزف بائیڈن

کسی بھی جمہوری ملک میں انتخابات کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، ہر جمہوری ملک میں نظام سیاست، نظم ونسق عامہ اور انتخابات کا طریقۂ کار مختلف ہے؛ ریاستہائے متحدہ امریکہ ایک آزاد اور خود مختار مملکت کی حیثیت سے ۱۷۷۷ء میں وجود میں آیا، امریکہ میں صدارتی جمہوریت ہے، یعنی مملکت کا ایک صدر ہوتا ہے، جس کو عوام یا جمہوریہ بالواسطہ منتخب کرتے ہیں؛ سارے انتظامی اختیارات صدر کو حاصل ہیں، وہ اپنی پالیسیوں کے لیے مقننہ یا کانگریس کے روبرو جواب دہ اور ذمہ دار بھی نہیں ہے۔ امریکی دستور کی رو سے ریاستہائے متحدہ امریکہ کی انتظامیہ کا حاکمِ اعلی صدر ہے، اس فرد واحد کو بے شمار اور وسیع انتظامی اختیارات حاصل ہیں، اختیارات کے اعتبار سے اسے دنیا کا سب سے بڑا بااختیار حاکم کہا جاتا ہے؛ لارڈ برائس نے اس عہدے کو دنیا کا سب سے بڑا عہدہ قرار دیا ہے۔

امریکی دستور کی رو سے صدر کا انتخاب بالواسطہ ہوتا ہے، اسے ایک ''انتخابی کالج'' چار سال کے لیے منتخب کرتا ہے، انتخابی کالج کے ممبروں کی تعداد ''کانگریس'' کے دونوں ایوانوں کی مجموعی تعداد کے برابر ہوتی ہے، ہر ریاست سے سنیٹ اور ایوان نمائندگان کے ممبروں کی تعداد کے برابر صدارتی انتخاب

کنندگان عام ووٹوں سے چنے جاتے ہیں، پھر یہ منتخب ممبران صدر کا انتخاب کرتے ہیں؛ انتخابی کالج کے ممبروں کی تعداد اس وقت ۵۳۹ ہے، کامیابی کے لیے ۲۷۰/الیکٹورل ووٹ ضروری ہیں؛ ہر چوتھے سال نومبر کے شروع میں یہ انتخاب کنندگان ہر ریاست میں منتخب کیے جاتے ہیں، دسمبر کے مہینے میں منتخب ممبران ریاست کے دارالخلافہ میں جمع ہوکر صدر کو منتخب کرتے ہیں، اس کے بعد ہر ریاست کی طرف سے امریکی ایوان بالا کے صدر کو اس الیکشن کا سرٹیفکیٹ بھیجا جاتا ہے؛ جنوری کے شروع میں کانگریس کے دونوں ایوانوں کا مشترکہ اجلاس ہوتا ہے، اس میں ووٹ گنے جاتے ہیں اور سب سے زیادہ ووٹ پانے والے امیدوار کو صدر منتخب قرار دیا جاتا ہے؛ نیا صدر ۲۰/جنوری کو اپنے عہدے کا حلف لیتا ہے اور اپنے عہدے کی ذمے داریاں سنبھالتا ہے۔ اگر کوئی امیدوار مقررہ ووٹ حاصل نہ کر سکے تو ایوان نمائندگان سب سے زیادہ ووٹ حاصل کرنے والے نمائندے کو منتخب کر لیتے ہیں، اگر یہ کوشش بھی ناکام رہے تو پھر نائب صدر، صدر کا عہدہ سنبھال لیتا ہے۔

اگرچہ امریکی دستور نے بالواسطہ انتخاب کا نظام رکھا ہے، لیکن عملاً صدر کا انتخاب بلا واسطہ ہوتا ہے۔ صدارتی انتخابات سے پہلے ریاستہائے متحدہ امریکہ کی سیاسی پارٹیاں اپنا ''کنونشن'' منعقد کرتی ہیں اور اس عہدے کے لیے اپنا امیدوار نامزد کرتی ہیں؛ ہر ریاست صدر کا انتخاب کرنے والی جماعت یعنی انتخابی کالج کے لیے اپنے نمائندوں کو نامزد کرتی ہے اور ووٹر اپنی مرضی کے مطابق ان نمائندوں کو ووٹ دیتے ہیں۔ صدارتی انتخاب کنندگان کے انتخاب میں کسی پارٹی کے امیدوار کی کامیابی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ صدارت کے لیے

اس پارٹی کے امیدوار کو اس ریاست سے کامیابی حاصل ہوئی۔ ہر ریاست میں انتخابات اور کانگریس میں ووٹوں کا شمار محض دستوری رسم کو پورا کرنے کے لیے کیا جاتا ہے، ورنہ عملاً صدر کا انتخاب صدارتی انتخاب کنندگان کے انتخاب کے وقت ہی ہو جاتا ہے۔

امریکہ میں دو پارٹی نظام رائج ہے، ایک ''ڈیموکریٹک پارٹی'' ہے اور دوسری ''ری پبلیکن'' پارٹی ہے؛ دونوں پارٹیوں کے پروگرام اور پالیسی تقریبا ایک ہی جیسے ہیں، دونوں کی خارجہ پالیسی اور معاشی پروگرام میں بھی کوئی زیادہ اصولی فرق نہیں ہے؛ البتہ امریکی سیاسی پارٹیوں پر معاشی مفاد کا اثر پڑتا ہے، مثلاً صنعتی، مالی اور تجارتی حلقے ہمیشہ ''ری پبلیکن پارٹی'' کی تائید کرتے ہیں؛ کسان اور زراعت پیشہ آبادی رکھنے والی ریاستیں ''ڈیموکریٹک پارٹی'' کی تائید کرتی ہیں۔ سابق صدر ''ڈونالڈ ٹرمپ'' ری پبلیکن پارٹی سے تھے اور امریکہ کے نئے صدر ''جو بائیڈن'' ڈیموکریٹک پارٹی سے ہیں۔ اس سے پہلے دو مرتبہ لگاتار صدر رہنے والے ''براک اوباما'' بھی ڈیموکریٹک پارٹی سے تھے۔

امریکہ کا حالیہ الیکشن (۲۰۲۰ء) بڑا دلچسپ اور غیر معمولی اہمیت کا حامل رہا ہے، ایک طرف ''ری پبلکن پارٹی'' سے ''ڈونالڈ ٹرمپ'' دوبارہ صدر بننے کے لیے پرعزم تھے، دوسری جانب ''ڈیموکریٹک پارٹی'' کی طرف سے لمبا سیاسی تجربہ رکھنے والے ''جو بائیڈن'' صدر بننے کی دوڑ میں تھے۔ زبردست سیاسی گہما گہمی اور انتخابات کے بعد نتائج ''جو بائیڈن'' کے حق میں آئے، جو بائیڈن نے مطلوبہ ۲۷۰ / الیکٹورل ووٹ حاصل کر لیے اور وہ امریکہ کے نئے صدر منتخب ہو گئے۔

جوزف بائیڈن امریکی ریاست ''پنسلوانیا'' کے شہر ''اسکرینٹن'' میں ۱۹۴۲ء میں پیدا ہوئے، لیکن جب ان کی عمر صرف دس برس تھی تو ان کا گھرانہ ریاست ''ڈیلاویئر'' منتقل ہو گیا تھا۔ بائیڈن نے ''ڈیلاویئر یونیورسٹی'' سے ''پولیٹیکل سائنس'' کی تعلیم حاصل کی اور پھر قانون کی ڈگری حاصل کی، انہوں نے سیاست کا رخ کرنے سے قبل بطور وکیل بھی کام کیا ہے، وہ ماہر قانون، سیاست داں اور وکیل ہیں۔

امریکہ کے نئے صدر ''جوزف بائیڈن'' اپنے سیاسی سفر کی ایک لمبی تاریخ رکھتے ہیں، جو تقریباً نصف صدی پر محیط ہے؛ بائیڈن کا سیاسی سفر ۱۹۷۲ء میں امریکی سینیٹ کا رکن منتخب ہونے کے ساتھ شروع ہوا، اس وقت ان کی عمر صرف ۲۷ر برس تھی، اس طرح وہ امریکا کی تاریخ میں چھٹے کم عمر ترین ''سینیٹر'' بن گئے۔ کرسیٔ صدارت تک پہنچنے کی بائیڈن کی خواہش بھی کوئی نئی بات نہیں ہے، وہ ۱۹۸۸ء میں پہلی مرتبہ ''ڈیموکریٹک پارٹی'' کی جانب سے صدارتی امیدوار کے طور پر نامزد ہوئے تھے، اس کے بعد ۲۰۰۸ء میں انہوں نے ایک بار پھر خود کو صدارتی امیدوار کے لیے نامزد کیا، مگر جلد ہی وہ صدارتی انتخابات کی دوڑ سے دست بردار ہو گئے؛ اس کے بعد ''اوباما'' نے انہیں اپنے نائب کے عہدے کی پیش کش کی اور وہ نائب صدر منتخب ہوئے، جس کی بنا پر انہیں ''سینیٹ'' سے مستعفی ہونا پڑا تھا۔ ''براک اوباما'' کے زمانے میں ۲۰۰۹ء سے ۲۰۱۷ء تک ''جو بائیڈن'' دو مرتبہ نائب صدر رہے ہیں۔

''براک اوباما'' کے ساتھ ''بائیڈن'' کا مضبوط تعلق ۲۰۰۸ء میں ساتھ کام کرنے کے وقت سے لے کر اب تک واضح ہے۔ اگرچہ اوباما نے

۲۰۲۰ء میں تمہیدی انتخابات میں کامیابی سے قبل ''بائیڈن'' کی حمایت کا اعلان نہیں کیا، تاہم دونوں کے درمیان گہرے روابط کے نتیجے میں بائیڈن کو اقلیتوں بالخصوص ''سیاہ فاموں'' کے بیچ بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

بائیڈن اپنے حریف ''ری پبلکن پارٹی'' کے ارکان کے ساتھ اپنی غیر مخاصمانہ قربت کے حوالے سے بھی جانے جاتے ہیں، اس کی نمایاں ترین مثال آنجہانی ری پبلکن سینیٹر ''جان میک کین'' کے ساتھ بائیڈن کا قریبی تعلق ہے۔ ''مک کین'' ۲۰۰۸ء میں صدارتی انتخابات میں ''براک اوباما'' کے حریف تھے، تاہم اس مسابقت اور اختلاف رائے نے بائیڈن اور مک کین کے تعلق پر کوئی منفی اثر نہیں ڈالا۔

امریکہ کے نئے صدر جوزف بائیڈن نے جیت حاصل کرنے کے بعد اپنے اولین خطاب میں کہا ہے کہ: مخالفین کو دشمن کی طرح نہ دیکھیں، وہ امریکی ہیں، امریکیوں کی طرح دیکھیں، یہ وقت نسل پرستی کا خاتمہ کرنے کی جنگ کا ہے، لوگوں کو تقسیم نہیں، متحد کرنا ہے۔ نیز انہوں نے اپنے ''ٹویٹ پیغام'' میں کہا ہے کہ وہ تمام امریکیوں کے صدر ہیں۔ اب دیکھنا ہوگا کہ وہ امریکیوں خصوصا اقلیتوں کی امیدوں پر کتنا کھرا اترتے ہیں؟ اور ان کی صدارت میں امریکہ کس سمت جائے گا اور عالمی سطح پر ان کی صدارت کے کیا اثرات مرتب ہوں گے؟

مغربی ذرائع ابلاغ؛ عالم اسلام کے لیے لمحۂ فکریہ

آج کے جدید دور میں ''انٹرنیٹ'' اور ''میڈیا'' نے انسان کے لیے ایک ایسے ثقافتی ادارے کی حیثیت حاصل کرلی ہے، جس کے بغیر زندگی کا سفر ناممکن سا معلوم ہوتا ہے؛ اجتماعی زندگی کے دونوں عنصر مرد اور عورت اسی انٹرنیٹ اور میڈیا سے معلومات و تجربات حاصل کرتے ہیں، اور اس کے فراہم کردہ توشے کو اپنی غذا بناتے ہیں؛ آج کا میڈیا اور انٹرنیٹ جو کچھ پیش کرتا ہے لوگ اس پر غیر معمولی اعتماد ویقین کرتے ہیں۔ انٹرنیٹ کی رفتار بجلی سے بھی زیادہ سریع السیر ہے، منٹوں اور سکنڈوں میں کوئی بھی بات دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچائی جاسکتی ہے، اور پوری دنیا کے حالات سے ہر وقت باخبر رہا جاسکتا ہے۔

اس دور میں انٹرنیٹ، میڈیا اور قومی ترقیات کے درمیان چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس بات کو سب سے زیادہ یہودیت اور مغربی ممالک نے سمجھا ہے، انہوں نے اپنے افکار ونظریات، اپنے مذہب کی ترویج و اشاعت اور اپنے پروپیگنڈے کو پھیلانے کے لیے میڈیا اور انٹرنیٹ کو آلہ کار بنایا اور سب سے زیادہ اسی کا استعمال کیا۔

۱۸۹۷ء میں ''سوئیز رلینڈ'' کے شہر ''بال'' میں تین سو یہودی دانشور،

مفکر اور فلسفی جمع ہوئے تھے اور انہوں نے پوری دنیا پر حکمرانی کا منصوبہ تیار کیا تھا، جس میں ''ذرائع ابلاغ'' کو بنیادی اہمیت دی گئی تھی، اس کی غیر معمولی اہمیت اور اس کی تاثیر وافادیت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا گیا تھا: ''اگر ہم یہودی پوری دنیا پر غلبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ذرائع ابلاغ بھی ہمارے مقاصد کے حصول کے لیے اہم درجہ رکھتا ہے، ہم میڈیا کے سرکش گھوڑے پر سوار ہو کر اس کی باگ ڈور کو اپنے قبضہ میں رکھیں گے، ہمارے قبضے اور تصرف میں ایسے اخبارات اور رسائل ہوں گے جو مختلف گروہوں اور جماعتوں کی تائید وحمایت کریں گے، ہم جب اور جہاں چاہیں گے قوموں کے جذبات کو مشتعل کریں گے اور اس کے لیے ہم صحیح اور جھوٹی خبروں کا سہارا لیں گے، ہم ایسے اسلوب سے خبریں پیش کریں گے کہ قومیں اور حکومتیں ان کو قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں''۔ (مغربی میڈیا اور اس کے اثرات)

صہیونیت اور مغربی ممالک نے اپنے منصوبوں کی تکمیل کے لیے بڑی غیر معمولی ذہانت سے کام لیا ہے، ذرائع ابلاغ کا سہارا لے کر پوری دنیا پر اپنا جال بچھا دیا ہے، بظاہر وہ اس میں کامیاب بھی نظر آرہے ہیں؛ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ وہاں ہر شخص کو اخبار ورسائل، ریڈیو اسٹیشن اور ٹی وی چینل وغیرہ قائم کرنے کی کھلی آزادی اور ہر طرح کی سہولت حاصل ہے۔ اور جب عالمی صحافت (پرنٹ میڈیا) پر نظر ڈالی جاتی ہے، تو سب سے زیادہ اخبارات و رسائل (روزنامہ، سہ روزہ، ہفت روزہ، پندرہ روزہ، سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ) مغربی ممالک سے ہی جاری ہوتے ہیں۔

ایسے وقت میں جب کہ مغرب نے عالمی ذرائع ابلاغ اور عالمی صحافت

پر اپنا سکہ جما رکھا ہے اور ہر طرح کے جھوٹے پروپیگنڈے اور مکر وفریب کی حکمرانی ہے، نوجوانوں کو اپنی طرف کھینچا جارہا ہے، انہیں مذہب سے دور کرنے کے لیے آئے دن نئے نئے تباہ کن پروپیگنڈے کیے جا رہے ہیں، مسلم معاشرے کو تباہ وبرباد اور مغرب پرست بنانے کی بھرپور کوشش کی جارہی ہے۔۔۔ عالم اسلام کے لیے لمحۂ فکریہ ہے، بلکہ اسلامی ذرائع ابلاغ کی ذمہ داری ہے کہ اس میدان میں مضبوطی حاصل کریں، انٹرنیٹ، میڈیا اور تمام ذرائع ابلاغ پر اپنا تسلط جمائیں، اپنے فنی و مادی وسائل کو بروئے کار لاکر ذرائع ابلاغ کے میدان میں مضبوط پیش رفت کریں، انٹرنیٹ اور میڈیا کی تمام طاقتوں کو اپنے حق میں استعمال کریں، اور ہر حال میں حقیقت شناسی اور راست بازی سے کام لیتے ہوئے مغرب کے منصوبوں کو بے نقاب کریں؛ حقائق کتنے ہی تلخ کیوں نہ ہوں، ان لوگوں کو حقیقت شناسی اور امن وامان کے ساحل سے ہمکنار کریں، جو جھوٹے پروپیگنڈوں پر یقین کر کے ظلمت کے طوفان بلاخیز میں بہتے جارہے ہیں۔ اپنی ذاتی مجلسوں اور کمروں میں بیٹھ کر اظہار افسوس اور تبصروں سے کچھ ہونے والا نہیں ہے، آج عصر حاضر کے تقاضوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

اجماع کن لوگوں کا معتبر ہے؟

(حسامی کی بحث کا خلاصہ)

شریعت کے اصول وماخذ میں سے تیسری اصل اجماع ہے۔ اجماع کن لوگوں کا معتبر ہے؟ اس سلسلے میں اختلاف ہے۔ داؤد ظاہری، شیعہ اور ایک روایت کے مطابق امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے نزدیک صرف صحابہ کا اجماع معتبر ہے۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ فرمان باری تعالی: **كنتم خير امة اخرجت للناس** (سورہ آل عمران) اور **وكذلك جعلنا كم امة وسطا** (سورہ بقرہ) کے مخاطب صرف صحابہ کرام ہیں، کیوں کہ ان آیات کے نزول کے وقت صرف یہی حضرات موجود تھے، لہذا ان ہی کا اجماع معتبر ہوگا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جمہور کے نزدیک ان آیات کے مخاطبین صرف صحابہ کرام ہی نہیں ہیں، بلکہ صحابہ کے بعد والے مسلمان بھی ان آیات کے مخاطب ہیں۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: اجماع کا حق صرف اہل مدینہ کو ہے، کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **المدينة كالكير تنفي خبثها... كما ينفي الكير خبث الحديد** (مؤطا امام مالک) مدینہ لوہار کی بھٹی کی طرح ہے، وہ اپنے سے خباثت کو اسی طرح دور کر دیتا ہے جس طرح بھٹی لوہے کی خباثت دور کر دیتی ہے۔ خطا بھی ایک طرح کی گندگی ہے، اور مطلب یہ

ہے کہ اہل مدینہ سے خطا نہیں ہوسکتی، لہذا اجماع صرف اہل مدینہ کا معتبر ہوگا۔
اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ اس حدیث سے صرف مدینے کی تعریف ہو رہی ہے، اور کسی کی تعریف کرنے اور فضیلت بیان کرنے سے کسی کی نفی مقصود نہیں ہوتی؛ نیز اس حدیث میں اس بات پر بھی دلالت نہیں ہے کہ اہل مدینہ کے علاوہ کسی کا اجماع معتبر ہی نہ ہو۔

بعض لوگوں (روافض میں سے فرقہ زیدیہ اور امامیہ) کا کہنا ہے کہ:
صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ داروں کا اجماع معتبر ہے۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے: **انما یرید الله لیذهب عنکم الرجس اهل البیت ویطهر کم تطهیرا** (سورہ احزاب) اس آیت کریمہ میں ''رجس'' سے مراد خطا ہے، مطلب یہ ہے کہ اہل بیت سے خطا منتفی ہے، ان کا قول وفعل صواب ہی صواب ہوتا ہے؛ لہذا صرف انہی کا اجماع معتبر ہوگا۔ نیز حدیث میں ہے: **انی تارك فیکم الثقلین ما ان تمسکتم بهما لن تضلوا بعدی کتاب الله وعترتی اهل بیتی۔** (ارشاد القلوب ۱/۱۳۱) اس حدیث سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ صرف ''عترت رسول'' کا اجماع معتبر ہے۔ ان حضرات کے دلائل کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ آیت کے اندر ''رجس'' سے خطا مراد نہیں ہے، بلکہ تہمت مراد ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالی نے فاحشہ عورتوں کی تہمت سے ازواج مطہرات کو دور کرنے کا ارادہ کیا ہے، اور یہ آیت ازواج مطہرات کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اور مذکورہ حدیث خبر واحد ہے اور خبر واحد خود روافض کے نزدیک قابل عمل نہیں ہوتی ہے، تو استدلال کیسے درست ہوگا؟ دوسری بات یہ ہے کہ اس حدیث کی نقل بھی صحیح نہیں ہے، اور محدثین کے یہاں

اس پر کلام ہے، صحیح روایت اس طرح ہے: **ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتم بھما کتاب اللہ و سنتی۔** (مؤطا امام مالک) صحیح روایات میں "**سنة**" کا لفظ وارد ہے۔

اس سلسلے میں صحیح اور درست موقف یہ ہے کہ ہر زمانے کے عادل اور مجتہد علماء کو اجماع منعقد کرنے کا حق حاصل ہے، اصل اجماع میں اجتہاد اور علم ہے، جگہ اور زمانے وغیرہ کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے؛ لہذا ہر زمانے کے عادل اور مجتہد علماء کا اجماع معتبر ہوگا۔ یہی احناف کا مسلک بھی ہے۔

زبان اور قلم ایک قیمتی جوہر ہے

آج کے اس ترقی یافتہ دور میں دین اسلام کے خلاف طرح طرح کی سازشیں ہورہی ہیں، کہیں اسلام کے نام پر بے حیائی کورواج اور فروغ دیا جارہا ہے، کہیں انٹرنیٹ اور میڈیا کے ذریعے اسلام پر حملے کیے جارہے ہیں، آج مادیت کے نشے میں طرح طرح کی سازشیں کر کے ذہنوں کو جھنجوڑا جارہا ہے، اسلام کی شبیہ خراب کرنے اور لوگوں کو دین اسلام سے دور رکھنے کے لیے نت نئے حربے استعمال کئے جارہے ہیں؛ جبکہ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اسلام کا چراغ نہ کبھی گل ہوا ہے، نہ ہوگا؛ پھونکوں سے یہ چراغ کبھی نہیں بجھے گا، ہر زمانے میں اسلام کے چراغ کو گل کرنے کی کوشش کی گئی اور ہر دور میں تحریک اسلام کو دبانے اور کچلنے کے لیے دوڑ دھوپ محنتیں کی گئیں، لیکن تاریخ جانتی ہے کہ اسلام کے وفاداروں نے ہر موڑ پر اسلام کا تحفظ کیا؛ دین ودیانت، شریعت وسنت اور اخلاق ومعاشرت کے تحفظ میں اپنا نہ مٹنے والا نقش چھوڑا؛ اسلام کے سپوتوں نے فلاح وصلاح کی ایک عظیم تاریخ رقم کی، اور دنیا والوں کے سامنے نے یہ واضح کیا کہ، آندھیوں ہمیں نہ چھیڑو، ہمیں ہوا کے رخ پر چراغ جلانے ہیں، ہمیں ستاروں کے پار جانا ہے۔

تاریخ کے اوراق سے معلوم ہوتا ہے کہ احقاق حق اور ابطال باطل کے

لیے جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت پڑی ہے، وہ زبان وقلم ہے؛ زبان وقلم ایک ایسا ہتھیار ہے، جس کے ذریعے ماضی میں انقلاب آیا اور آج کے بگڑے ہوئے حالات میں بھی زبان وقلم کے ذریعے نکھار لایا جاسکتا ہے؛ زبان وقلم ایک ایسی نعمت خداوندی ہے جس کے ذریعے ہر الجھے ہوئے مسئلے کو سلجھایا جاسکتا ہے، یہ ایک ایسا قیمتی جوہر ہے، جس کے ذریعے مردہ دلوں میں روح پھونکی جاسکتی ہے، اور معاشرے میں ایک صالح انقلاب لایا جاسکتا ہے۔

لہذا اس پرفتن دور میں جسے ''الیکٹرونک میڈیا اور پرنٹ میڈیا'' کا دور کہا جاتا ہے، ہمارے لیے ضروری ہے کہ اس میدان میں خوب مہارت حاصل کریں۔ ادیب ماہر، خطیب کامل اور بہترین قلم کار بن کر افق عالم پر چمکیں، تاکہ تمام فتنوں کی سرکوبی کی جاسکے، ہر فتنے کا مقابلہ کیا جاسکے، ہر اسلام مخالف تحریک کو روکا جاسکے؛ نت نئے لٹریچر اور رسائل و بیانات جو ہمارے دروازوں پر دستک دے رہے ہیں، ان کا دندان شکن جواب دیا جاسکے، ہر الجھے ہوئے مسئلے کو سلجھایا جاسکے، اور الحاد و دہریت کے طوفان بلاخیز کو روکا جاسکے۔

اللہ تعالی نے زبان وقلم کا تذکرہ قرآن کریم میں بھی کیا ہے، سورۂ رحمن میں زبان کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے: **علمه البيان**، کہ اللہ تعالی نے انسان کو قوت گویائی عطا کی اور مافی الضمیر کی ادائیگی کا سلیقہ سکھایا۔ اور سورۂ علق میں قلم کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: **الذي علم بالقلم علم الانسان مالم يعلم**، کہ اللہ تعالی وہ ذات ہے جس نے انسان کو قلم کے ذریعے سے بے شمار باتوں کی تعلیم دی، اور وہ چیزیں سکھائیں جنہیں وہ نہیں جانتا تھا۔ نیز اللہ پاک نے قلم کی قسم بھی کھائی ہے، فرمایا: **ن والقلم وما يسطرون** (سورہ ن) قسم ہے قلم کی اور اس

کی جو وہ لکھتا ہے۔ اس سے زبان اور قلم کی اہمیت بخوبی واضح ہوتی ہے۔

بہرحال زبان و قلم ایک قیمتی جوہر ہے، اس کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے زبان و قلم کے فن میں خوب عبور حاصل کیا جائے۔

آج ٹھنڈے قلم کا نہیں، گرم تحریر کا دور ہے

آج جب کہ چہار دانگ عالم میں فتنوں کی یلغار ہے، عالم اسلام اپنی آب وتاب کھو رہا ہے؛صلیبیت ،صہیونیت، مجوسیت اور دہریت سر چڑھ کر بول رہی ہے، ان کے قلم آزاد نظر آ رہے ہیں، اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈے اور تمام قسم کی سازشیں کی جا رہی ہیں، اخبارات ورسائل کی سرخیاں آئے دن گردش کرتی رہتی ہیں کہ اسلام اور پیغمبر اسلام کی شان میں نازیبا اور گستاخانہ الفاظ کہے اور لکھے گئے ؛ بعض لوگوں کے قلم اتنے آزاد نظر آتے ہیں کہ جو چاہتے ہیں لکھتے ہیں؛ کذب بیانی،حقیقت پر پردہ اور دجل و فریب ان کا موضوع سخن رہتا ہے، وہ ایسی ایسی باتیں لکھ مارتے ہیں،جنہیں دیکھ کر انسانیت بھی شرما جائے، دریاؤں کی طغیانی میں عظیم بھونچال آجائے، پرسکون سمندر ٹھاٹھے مارنے لگے،آسمان کو چھوتے پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں؛ یہی وہ لوگ ہیں جن کا مقصد زمین میں فساد پھیلانا ہے۔

ایسے وقت میں جب کہ پوری دنیا ’’مادیت‘‘ کے نشے میں محو تماشا ہے، اغیار قلم پر اپنا سکہ جمائے بیٹھے ہیں؛ ہم تاریخ کا اجمالی تجزیہ کرتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ لغت وادب، فصاحت و بلاغت اور جدتِ اسلوب نبوت کی میراث اور ہمارے اسلاف کی امانت ہے، اور ہم اپنی وراثت وامانت پر مفاد پرست،

سیاسی، صہیونی، صلیبی، مجوسی اور دہریوں کا قبضہ مزید برداشت نہیں کر سکتے؛ ہمارا قلم غلام نہیں آزاد ہونا چاہیے، یہ باطل کا نہیں اسلام کا ترجمان ہو، اس پر ملحدوں کا نہیں اسلام پسندوں کا قبضہ ہو، قلم ہی سے قوموں کے ماضی، حال اور مستقبل کی داستانیں وابستہ ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ اگر قلم اسلام پسندوں کے ہاتھوں میں رہے تو لطائف و نکات، علوم و معارف اور انوار و برکات کے دریا بہا دے؛ جس کے نتیجے میں صالح معاشرہ اور پر امن انقلاب کی راہیں ہموار ہوں۔ اور اگر یہی قلم شیطانوں، دجالوں، شریروں اور فتنہ پرور لوگوں کے ہاتھ لگ جائے، تو معاشرے سے امن وامان، صلح و آشتی اور حقیقت شناسی ختم ہو جائے۔ فساد اور لڑائی جھگڑے معاشرے کا مقدر بن جائیں۔

فتنوں کی سرکوبی کے لیے آج ٹھنڈے قلم کا نہیں، گرم تحریر کا دور ہے؛ دفاع کے بجائے اقدام کی ضرورت ہے، کیوں کہ ٹھنڈی تحریروں کی نہ ماضی میں کوئی تاریخ ہے، نہ حال میں کوئی بڑا کارنامہ اور نہ ہی مستقبل میں ان سے کسی انقلاب کی توقع ہے۔ قلم کے ذریعہ عظیم انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے، حالات کا رخ موڑا جا سکتا ہے، نت نئے فتنوں کی سرکوبی بخوبی کی جا سکتی ہے، باطل کے حوصلوں کو پست کیا جا سکتا ہے۔

لہذا اس نئے دور میں جب کہ فصاحت و بلاغت اور انشا پردازی اپنے عروج پر ہے، اسلامی صفوں کے سپوت جو کسی بھی حیثیت سے اسلام کی خدمت کرنا چاہتے ہیں، ان کے لیے ناگزیر ہے کہ جہاں وہ فن خطابت میں عطاء اللہ شاہ بخاری، حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور شبیر احمد عثمانی ہوں؛ وہیں تحریر میں ابوالکلام

آزاد کا جوش، علی میاں کی روانی، منظور احمد نعمانی کی تاثیر، شبلی کی جولانی، سلیمان ندوی کی بلند فکر، بدر عالم میرٹھی کی شادابی، مناظر احسن گیلانی کی البیلی شیفتگی، دریابادی کی برجستگی اور جمال الدین افغانی کا ابلتا ہوا ولولہ رکھتے ہوں؛ ان کی آنکھوں میں نور بصیرت ہو، دل میں درد اور طبیعت میں احساس ہو، لہجے میں گھن گرج ہو، اسلوب میں بجلیاں کوندتی ہوں اور انداز بیان میں جوش وخروش کا ایک سیلاب امنڈتا ہو؛ جس سے باطل کے حوصلے پست ہو جائیں اور عالم اسلام کو ایک نئی روح ملے۔

مٹ گئی تیرگی، ہوگئی روشنی
جب ستاروں میں ماہِ تمام آ گیا

انسانی تاریخ بتاتی ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں عالم انسانیت سسک رہا تھا، گلشن ارضی ماتم کدہ بنا ہوا تھا، فضائے کائنات پر ظلم وستم کی تیرہ وتاریک گھٹاؤں کی حکمرانی تھی، ہر طرف نفرت وعداوت اور وحشت وبربریت کے شعلے بھڑک رہے تھے، کمزوروں اور بے کسوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے جارہے تھے، چوری، زنا، شراب نوشی عام تھی؛ عورتوں کے حقوق کی پامالی کی جاتی تھی اور ان کو جانوروں سے بھی بدتر اور حقیر سمجھا جاتا تھا، معصوم بچیوں کو زندہ درگور کردیا جاتا تھا، لوگ خالق کائنات کو بھول گئے تھے؛ شرک وبت پرستی، ستاروں کی پوجا، آگ، سورج اور چاند کی پرستش عروج پر تھی؛ علم نجوم، کہانت اور سحر سر چڑھ کر بول رہا تھا، کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔ غرض تاریخ انسانی کا بدترین دور تھا، انسانیت نے حیوانیت کا لبادہ اوڑھ لیا تھا اور پوری دنیا انتہائی نازک دور سے گزر رہی تھی۔

ظلمت وگمراہیت کے اس ماحول میں اچانک خدا کا آخری پیغمبر آفتابِ نبوت بن کر ربیع الاول کے مہینے میں بوقت صبح فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہوا، یا یوں کہئے! کہ دعائے ابراہیم اور بشارت عیسی پہلوئے آمنہ سے

ظاہر ہوئی۔ یعنی وہ جس کے وجود سے خوابیدہ بیدار ہوئے اور بیدار ہوشیار بنے، جس کی بصیرت سے نابیناؤں نے بینائی پائی اور بینا ہدایت یافتہ بنے۔ جس کی ایک آواز سے کفر کی دنیا برباد ہوئی اور توحید کا عالم تعمیر ہوا، جس کی ایک پکار سے ظلمتِ شرک کافور ہوئی اور نور ایمان چمک اٹھا؛ جس نے مظلوم عورتوں کو ان کے حقوق اور باعزت مقام دیا اور معصوم کلیوں کو مسکرانے کا حق عطا کیا۔

اس کی ولادت کا دن تاریخ انسانی کا مبارک اور روشن ترین دن ہے۔ عالم قدس میں اسی کے احترام کا انبیاء سے عہد لیا گیا تھا اور رسولوں نے اسی کے آنے کی بشارتیں دی تھیں، اس کو حضرت داؤد نے ''محمد یم'' کہہ کر پکارا، تو حضرت عیسیٰ نے ''**مبشرا برسول یاتي من بعدي اسمه احمد**'' کا مژدہ سنا کر اس کی آمد کا پیغام دیا۔

اس عالم فانی میں اس ماہِ تمام کے جلوہ گر ہوتے ہی ہر سمت نور ہی نور نظر آنے لگا، اسلام پھیلا تو پھیلتا چلا گیا، کاروان ایمان بنا تو بنتا چلا گیا؛ دیکھتے ہی دیکھتے صنم خانے ویران ہونے لگے، مسجدیں آباد ہونے لگیں، لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے، ظالم و جابر امن پسند بننے لگے، باغ ہستی کی ساری بہاریں واپس لوٹنے لگیں، مسکراتی کلیاں اور لہلہاتے پھول و پودے سرسبز وشاداب ہونے لگے؛ ابلتے چشمے، بل کھاتی ندیاں، سمندر کی مست لہریں، خاموش جھیلیں اور پہاڑوں سے گرتی آبشاریں اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنے لگیں؛ اور کیوں نہ ہو؟ جب کہ اسی کے لیے اس عالم کو بنایا اور سجایا گیا تھا، بس دیر تھی اس کے جلوہ گر ہونے کی، دیر تھی اس کے افق پر چمکنے کی۔

مولانا مناظر احسن گیلانی اس ماہِ تمام کی آمد اور اس کے بعد برپا ہونے

والے عظیم انقلاب کی اس طرح منظر کشی کرتے ہیں: ''یوں تو آنے کو تو سب ہی آئے، سب میں آئے، سب جگہ آئے، (سلام ہو ان پر) بڑی کٹھن گھڑیوں میں آئے؛ لیکن کیا کیجیے! کہ ان میں جو بھی آیا، جانے ہی کے لیے آیا، پر ایک اور صرف ایک جو آیا اور آنے ہی کے لیے آیا، وہی جو آگئے کے بعد پھر کبھی نہیں ڈوبا، چمکا اور پھر چمکتا چلا جا رہا ہے، بڑھا اور بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے، چڑھا اور چڑھتا ہی چلا جا رہا ہے؛ سب جانتے ہیں اور سبھوں کو جاننا ہی چاہیے کہ جنہیں کتاب دی گئی اور جو نبوت کے ساتھ کھڑے کیے گئے، برگزیدوں کے اس پاک گروہ میں اس کا استحقاق صرف اسی کو ہے اور اس کے سوا کس کو ہو سکتا ہے؟ جو پچھلوں میں بھی اس طرح ہے جس طرح پہلو میں تھا، دور والے بھی ٹھیک اس کو اسی طرح پا رہے ہیں اور ہمیشہ پاتے رہیں گے جس طرح نزدیک والوں نے پایا تھا، جو آج بھی اسی طرح پہچانا اور ہمیشہ پہچانا جائے گا جس طرح کل پہچانا گیا تھا کہ اسی کے اور صرف اسی کے دن کے لیے رات نہیں، ایک اسی کا چراغ ہے جس کی روشنی بے داغ ہے۔ (النبی الخاتم)

کیا ہم محسن انسانیت کے حقوق ادا کر رہے ہیں؟

محسن انسانیت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بے شمار فضائل اور احسانات کے ساتھ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ہم پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کیا کیا حقوق عائد ہوتے ہیں؟ اور ہم واقعی طور پر ان حقوق کو ادا کر رہے ہیں یا نہیں؟

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا حق آپ کی نبوت پر ایمان لانا ہے، آپ کو سچا نبی اور برحق رسول تسلیم کرنا ہے؛ ایمان لانے میں یہ بات بھی شامل ہے کہ آپ کے بتائے ہوئے احکامات پر ہمارا پورا یقین ہو، ہماری سوچ اور فکر یہ ہو کہ ہماری آنکھیں غلط دیکھ سکتی ہیں ہمارے کان غلط سن سکتے ہیں ہماری زبان غلط چکھ سکتی ہے، ہمارے ہاتھ چھونے اور محسوس کرنے میں غلطی کر سکتے ہیں؛ لیکن جو بات صحیح اور مستند طریقہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے وہ کبھی غلط نہیں ہو سکتی۔ اگر ہمارے دلوں میں یہ ایمان ویقین پختہ ہو جائے تو ہماری عملی زندگی میں ایک ایسا انقلاب آ جائے کہ ہمارے روز وشب اور شام وسحر بدل جائیں، معرفت وبصیرت اور دلوں میں نور پیدا ہو جائے۔

(۲) دوسرا حق حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنا ہے، آپ سے ہمارا تعلق محض قانونی یا رسمی نہیں، بلکہ ایسی اطاعت مطلوب ہے جس کے پیچھے بے

پناہ محبت کارفرما ہو، ایسی محبت کہ انسان لٹ کر محسوس کرے کہ اس نے بہت کچھ پایا ہے، ایسی محبت کہ انسان کچھ کھو کر محسوس کرے کہ اس نے بہت کچھ حاصل کیا ہے، ایسی محبت کہ جس میں کانٹوں کا بستر پھولوں کا لطف دے؛ یہی محبت آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کرام کو تھی۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کو اس کے باپ اور اس کی اولاد اور تمام انسانوں سے بڑھ کر محبوب نہ ہو جاؤں۔ (رواہ البخاری ومسلم) محبت کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ ہمیں آپ کی امت سے بھی محبت ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو اپنی اولاد کا درجہ دیا ہے، دیہات اور قریہ جات کے لوگ جو مقام نبوت سے کما حقہ واقف نہیں تھے آپ علیہ السلام کا رویہ ان کے ساتھ بھی محبت وشفقت کا ہوتا تھا؛ آپ ان کی غلطیوں کو معاف کرتے تھے، ان کی تندخوئی پر تحمل وبردباری سے کام لیتے تھے، امت کے ایک ایک فرد کا دکھ درد خود محسوس کرتے تھے؛ غرض یہ کہ پوری امت آپ کی شفقت ومحبت کے زیر سایہ تھی۔

(۳) تیسرا حق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا احترام اور آپ کی عظمت ہے۔ اللہ تعالی نے اس بات سے بھی منع فرمایا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم کلام ہوتے ہوئے کسی مسلمان کی آواز آپ کی آواز سے بلند ہو جائے۔ فرمایا: **یاایھا الذین آمنوا لاترفعوا اصواتکم فوق صوت النبي ولاتجھروا لہ بالقول کجھر بعضکم لبعض ان تحبط اعمالکم وانتم لاتشعرون (الحجرات)** اے ایمان والو! نبی کی آواز سے اپنی آواز بلند مت کرو، اور نبی کے سامنے اس طرح زور سے مت بولو جس طرح تم آپس میں بات کرتے ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ

بے خبری میں تمہارے اعمال ضائع ہوجائیں۔اس آیت کریمہ میں صاف طور پر یہ بتایا گیا ہے کہ مسلمانو! تم رسول اللہ کی آواز سے اپنی آواز کو بلند کرنے اور آپ کے سامنے بے محابا جہر یعنی کھل کر بات کرنے سے بچو، کیوں کہ ایسا کرنے میں خطرہ ہے کہ تمہارے اعمال حبط اور ضائع ہوجائیں، اور وہ خطرہ اس لیے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پیش قدمی یا آپ کی آواز پر اپنی آواز بلند کرکے مخاطب کرنا ایک ایسا امر ہے جس سے رسول اللہ کی شان میں گستاخی اور بے ادبی ہونے کا بھی احتمال ہے، جو ایذائے رسول کا سبب ہے۔ اگرچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے یہ وہم بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ بالقصد کوئی ایسا کام کریں جو آپ کی ایذا کا سبب بنے ،لیکن بعض اعمال جیسے تقدم اور رفع صوت اگرچہ بقصد ایذا نہ ہوں پھر بھی ان سے ایذا کا احتمال ہے، اس لیے ان کو مطلقاً ممنوع قرار دیا گیا۔ اور بعض معصیتوں کا خاصہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے ارتکاب کرنے والے سے توبہ اور اعمال صالحہ کی توفیق سلب ہوجاتی ہے اور وہ گناہوں میں منہمک ہوکر انجام کار کفر تک پہنچ جاتا ہے، جو حبط اعمال کا سبب ہے؛ اور کرنے والے نے چوں کہ اس کا ارادہ نہیں کیا تھا اس لیے اس کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ اس ابتلائے کفر اور حبط اعمال کا اصل سبب کیا ہے؟ ۔ یہ وہ ادب ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بیٹھنے والوں اور آپ کی خدمت میں حاضر ہونے والوں کو سکھایا گیا تھا۔اس کا منشا یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ملاقات اور بات چیت میں اہلِ ایمان آپ کا انتہائی احترام ملحوظ رکھیں، کسی شخص کی آواز آپ کی آواز سے بلند نہ ہو، آپ سے خطاب کرتے ہوئے لوگ یہ نہ بھول جائیں کہ وہ کسی عام آدمی یا اپنے برابر والے سے نہیں بلکہ اللہ کے رسول سے مخاطب ہیں؛ اس لیے

عام آدمیوں کے ساتھ گفتگو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گفتگو میں نمایاں فرق ہونا چاہیے اور کسی کو آپ سے اونچی آواز میں کلام نہ کرنا چاہیے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بحیثیت مسلمان ہم پر آپ علیہ السلام کا کس قدر احترام واجب ہے!۔

(۴) چوتھا حق آپ علیہ السلام کی اطاعت اور فرماں برداری ہے۔ یعنی آپ نے جن باتوں کا حکم دیا ان کی تعمیل اور جن باتوں سے منع کیا ان سے رکنا، آپ کے ایک ایک عمل پر اپنے عمل کی بنیاد رکھنا، آپ کی زندگی کو اپنے لیے اسوہ اور نمونہ بنانا؛ آپ علیہ السلام کی حیات طیبہ منشائے ربانی کا مظہر ہے؛ آپ کا اٹھنا، بیٹھنا، سونا، جاگنا، کھانا، پینا، جلوت وخلوت، لوگوں کے ساتھ تعلقات، دوستوں اور دشمنوں کے ساتھ سلوک، وضع وقطع اور لباس و پوشاک، غرض آپ کا ایک ایک عمل انسان کی عملی زندگی کے لیے نمونے کا درجہ رکھتا ہے؛ اور یہ انسانیت پر اللہ تبارک وتعالی کا بڑا احسان اور کرم ہے کہ آپ کی سنت اس طرح محفوظ کر دی گئی کہ آپ کی زندگی کھلی ہوئی ایک روشن کتاب ہے۔

(۵) پانچواں حق آپ علیہ الصلاۃ والسلام پر درود وسلام بھیجنا ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ رب العالمین نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام بھیجنے کی تاکید فرمائی ہے۔ ارشاد فرمایا: **ان الله و ملائكته يصلون على النبي يا ايها الذين آمنوا صلوا عليه وسلموا تسليما** (الاحزاب) **بیشک اللہ اور اس** کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں، اے ایمان والو! تم بھی نبی پر درود وسلام بھیجا کرو۔ اس کائنات میں ایک مؤمن کا سب سے بڑا محسن نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا، آپ کی پوری زندگی اس فکر اور غم میں گذری کہ میری

امت کا ایک ایک فرد عذابِ جہنم سے بچ جائے اور جنت میں داخل ہو جائے؛ تنہا یہی احسان اتنا بڑا ہے کہ زندگی اور زندگی کے سارے لمحات اُن پر قربان کر دیئے جائیں تو حق ادا نہ ہوگا؛ تاہم ایک امتی اتنا تو کر سکتا ہے اور کرنا بھی چاہیے جو حضور کا حق بھی ہے کہ جب بھی موقع ملے حضور علیہ السلام پر درود وسلام کا ہدیہ پیش کرے، اور اس میں ہمارا ہی فائدہ ہے، ہمیں سلامتی کی ضرورت ہے، ہم محتاج ہیں، ہمارے درود اور ہمارے سلام کی ضرورت حضور کو نہیں ہے، حضور کی ذات تو وہ ہے کہ خود خالقِ کائنات اور اس کے معصوم فرشتے ان پر درود وسلام بھیجتے ہیں؛ ضرورت تو ہمیں ہے، ہم درود وسلام ایک بار بھیجیں گے وہاں سے دس مرتبہ سلامتی کی دعا ملے گی، اور اس دعائے سلامتی کی قبولیت میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: جس نے مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجا اللہ تعالیٰ اُس پر دس رحمتیں نازل فرماتے ہیں۔ (رواہ مسلم) حضرت عبداللہ بن ابی طلحہ اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ تشریف لائے، تو آپ کے چہرۂ انور پر خوشی کے آثار نمایاں تھے، آپ نے ارشاد فرمایا: حضرت جبریل نے آکر (اللہ تعالیٰ کی جانب سے) مجھے یہ خوشخبری سنائی ہے کہ اے محمد! کیا آپ اس بات پر خوش نہیں ہیں کہ آپ کی امت میں سے جو بھی آپ پر ایک مرتبہ درود پڑھے گا میں اس پر دس رحمتیں بھیجوں گا اور آپ کی امت میں سے جو بھی آپ پر ایک مرتبہ سلامتی بھیجے گا میں اس پر دس مرتبہ سلامتی بھیجوں گا۔ (رواہ النسائی) فقہاء فرماتے ہیں کہ زندگی میں ایک مرتبہ نبی علیہ الصلاۃ والسلام پر درود وسلام بھیجنا فرض ہے اور جب بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ کیا جائے یا ذکر آئے تو ہر دفعہ درود بھیجنا واجب نہیں، مستحب ہے؛ جمہور فقہاء کا یہی مسلک

ہے اور ایک مجلس میں بار بار ذکر آئے تو ایک بار درود شریف پڑھنا کافی ہے اور ہر بار درود بھیجنا اولیٰ ہے۔(شرح الشفا:۲/۱۰۷)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان، آپ سے بے پناہ محبت، آپ کا احترام، آپ کی اطاعت وفرماں برداری اور درود وسلام وغیرہ ہم پر آپ کے بنیادی حقوق ہیں۔ لہذا ہم اپنا محاسبہ کریں اور اپنے اندر غور وفکر کریں کہ کیا ہم محسن انسانیت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق ادا کررہے ہیں؟

شیعیت کی ابتدا، پس منظر اور حقیقت

عہد نبوی میں پورا جزیرۃ العرب اسلام کے زیر اقتدار آ گیا تھا، وہاں کوئی دشمن طاقت ایسی باقی نہیں بچی تھی جو اسلام کا راستہ روک سکے؛ پھر عہد صدیقی اور فاروقی میں مزید مضبوطی آئی، اس کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں بھی اسلامی دعوت اور فتوحات کا سلسلہ برابر چلتا رہا، اور لوگ اپنے پرانے ادیان و مذاہب کو چھوڑ کر اسلام میں داخل ہوتے رہے؛ لیکن کچھ لوگ اس منصوبے کے ساتھ بھی مسلمان ہو رہے تھے کہ ان کو جب کبھی موقع ملے گا وہ کوئی فتنہ برپا کر کے اسلام کو نقصان پہنچائیں گے اور طرح طرح کی سازشیں کر کے اسلام کی جڑوں کو کھوکھلا کریں گے۔

اسی طبقے میں ''صنعاء'' کا ایک یہودی عالم ''عبداللہ بن سبا'' بھی تھا، اس نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں اپنے قبولِ اسلام کا اعلان کیا؛ بعد میں جو اس کا کردار سامنے آیا اس سے واضح ہو گیا کہ اس کا اصل مقصد مسلمانوں میں شامل ہو کر اپنے خاص کرتبوں اور مکر و فریب سے ان میں مقبولیت حاصل کر کے اسلام کی جڑیں کاٹنا اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف و شقاق پیدا کر کے فتنہ و فساد برپا کرنا تھا۔ اس نے دوسرے منافقین کے ساتھ مل کر نو مسلموں کو فریب دے کر اسلام کے مٹائے ہوئے خاندانی امتیاز اور نسلی

عصبیت کوتعلیم اسلامیہ اور مقاصد ایمانیہ کے مقابلے میں زندہ کرنے کے لیے خوب محنت کی۔عبد اللہ بن سبا نے مدینہ، بصرہ، کوفہ، دمشق اور قاہرہ کے تمام مرکزی شہروں میں تھوڑے تھوڑے دنوں قیام کر کے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے خلاف نہایت چالا کی، ہوشیاری اور شرارت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق دارِ خلافت ہونے کو نومسلم لوگوں میں اشاعت دے کر بنو امیہ اور بنو ہاشم کی پرانی عداوت وعصبیت کو جو مردہ ہو چکی تھی پھر زندہ کرنے کی خوب کوشش کی۔سب سے پہلے وہ مدینہ پہنچا اور مدینہ منورہ کے مختصر قیام کے دوران اس نے اپنی ذہانت سے مسلمانوں کی کمزوری کو بھانپ لیا، اور یہاں اس نے اپنے شر انگیز خیالات کی اشاعت کرنی چاہی، مگر چوں کہ یہاں صحابہ کرام کی کثرت اور ان کا اثر غالب تھا، لہذا اس کو ناکامی ہوئی اور خود ہاشمیوں نے ہی اس کے خیالات کو سب سے زیادہ ملعون ومردود قرار دیا۔مدینہ منورہ سے مایوس ہو کر وہ ’’حکیم ابن جبلہ‘‘ کے پاس بصرہ پہنچا، وہاں عراقی اور ایرانی قبائل کے نومسلموں میں اس نے کامیابی حاصل کی، اور چند لوگوں کو اپنا ہمنوا بنالیا؛ پھر وہ ملک شام گیا، یہاں بھی اس نے تھوڑی سی شرارت پھیلائی، لیکن حاکم شام حضرت امیر معاویہ کے بروقت مطلع ہو جانے سے زیادہ دنوں تک قیام نہ کر سکا؛ لہذا یہاں اس کو اپنے منصوبے کے مطابق کام کرنے کا موقع نہ ملا۔اس کے بعد وہ مصر پہنچا، وہاں اس نے ایسے لوگوں کو پالیا جن کو وہ آلہ کار اور اپنی مفسدانہ مہم میں مددگار بنا سکے؛ چناں چہ اس نے اسلامی احکامات اور دیگر شرعی امور میں خوب مبالغہ آرائیاں اور جعل سازیاں کیں، جس سے جاہلوں کا ایک بڑا طبقہ فریب کا شکار ہو گیا؛ اس کے بعد اس نے کہنا شروع کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت

وامامت اور حکومت کی سربراہی دراصل حضرت علی کا حق تھا، اس لیے کہ ہر نبی کا ایک وصی ہوا ہے، اور وصی ہی نبی کے بعد اس کی جگہ امت کا سربراہ ہوتا ہے، اور حضور کے وصی حضرت علی تھے، لہذا خلافت کے حق دار بھی وہی تھے؛ لیکن حضور کے دنیا سے پردہ فرما جانے کے بعد لوگوں نے سازش کر کے ابوبکر کو خلیفہ بنا دیا، اور انہوں نے اپنے بعد عمر کو نامزد کر دیا، پھر ان کے بعد بھی علی کے خلاف سازش ہوئی اور عثمان کو خلیفہ بنا دیا گیا، جو اس کے بالکل اہل نہ تھے؛ اس طرح کی سازشیں کر کے اور جھوٹے پروپیگنڈے پھیلا کے اس نے مصر کے علاوہ دوسرے بعض شہروں اور علاقوں میں بھی اپنے کچھ ہم خیال بنا لیے۔ اس کے بعد اس نے بڑے پیمانے پر ایک خفیہ سازش کی اور بلوائیوں کا ایک بڑا لشکر لے کر مدینہ پہنچ گیا، عبد اللہ بن سبا کی من گھڑت باتوں اور مکاریوں میں پھنس کر بلوائیوں نے مدینے والوں کو خوب خوف زدہ کیا، اور بالآخر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو شہید بھی کر دیا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ- جو اس وقت دنیا کی سب سے بڑی حکومت کے فرماں رواں تھے- اگر ان باغیوں کے خلاف طاقت استعمال کرنے کی صرف اجازت دے دیتے، تو وہ ہرگز نہیں ہو سکتا تھا، جو ہوا؛ لیکن آپ نے نہیں چاہا کہ آپ کی جان کی حفاظت کے لیے کسی کلمہ گو کے خون کا ایک قطرہ بھی زمین پر گرے، خود مظلومانہ شہید ہو کر اللہ کے حضور پہنچ گئے اور دنیا میں مظلومانہ شہادت وقربانی کی ایک عظیم مثال قائم کر دی۔

اس خونی فضا میں چوتھے خلیفہ حضرت علی رضی اللہ عنہ منتخب ہوئے، لیکن حضرت عثمان غنی کی مظلومانہ شہادت کے نتیجے میں امت مسلمہ دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی، عبد اللہ ابن سبا کا پورا گروہ بظاہر حضرت علی کی طرف داری میں تھا،

ان کا ایک عقیدہ یہ بھی ہو گیا تھا کہ حضرت علی اس دنیا میں خدا کا روپ ہیں، اور ان کے قالب میں خداوندی روح ہے، گویا وہی خدا ہیں۔ (نعوذ باللہ)۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب عراق کے شہر ''کوفہ'' میں اپنا دار الحکومت بنایا، تو یہ علاقہ اس گروہ کی سرگرمیوں کا خاص مرکز بن گیا، یہاں اس گروہ کو اپنے مشن میں زیادہ کامیابی حاصل ہوئی، اور عبداللہ ابن سبا کا لگایا ہوا پودا خوب تناور ہو گیا، جس کا سایہ نہایت ہی برا تھا؛ ان حضرات نے شریعت اسلامیہ کے خلاف خوب عقائد گھڑے، حتی کہ صحابہ کرام کو گالیاں بھی دیں؛ بہت سے لوگوں نے ان ظاہر پرست مسلمانوں پر اعتماد کر لیا، حالاں کہ یہ لوگ اسلام کے نام لیواؤں کے قاتل بھی بنے اور محب بھی۔ بقول بعض: صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں۔ بعض روایات کے مطابق حضرت علی اور حضرت حسن رضی اللہ عنہما نے ان لوگوں کا کردار سامنے آنے پر انہیں سخت سزائیں دیں۔ اس فتنے نے تیس ہجری سے چالیس ہجری تک مسلمانوں کو خانہ جنگی میں مصروف رکھ کر اسلام کو خوب نقصان پہنچایا۔ ان منافقین اور تقیہ پرست گروہ کا نام شیعہ ہے، جس کی جڑیں یہودیت سے ملتی ہیں۔

انٹرنیٹ؛ نفع وضرر کے میزان میں

ایک لمبے زمانے تک انسان چاند، سورج، ستاروں اور سیاروں کی طرف بڑی حیرت وحسرت سے دیکھتا تھا، پھر انسان نے اپنی خودی کو پہچانا اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت عقل کے نور سے اس کے اندر شعور وآگہی کی شمعیں روشن ہوئیں؛ عقل وشعور نے انسان کو بلند خیالی، بلند پرواز، اور بلند فکر ونظر عطا کی؛ اور پھر انسان چاند، سورج، ستاروں اور سیاروں کی طرف بڑھنے لگا؛ جس کے لیے انسان نے ایجادات کے انبار لگا دیے، بہت سی محیر العقول چیزیں ایجاد کر ڈالیں، ان ایجادات نے انسانی زندگی کی مشکلات کو آسانیوں میں تبدیل کر دیا؛ ان ایجادات میں سے ایک اہم ایجاد انٹرنیٹ کا مواصلاتی نظام ہے۔

بہت عرصہ پہلے ''امریکہ'' میں ایک شخص نے خواب دیکھا تھا کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ دنیا کے ہر گھر میں ''کمپیوٹر'' ہوگا، پھر اس نے اپنے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے ایک کمپنی بنائی، وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ کمپنیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، اور'' کمپیوٹر ٹیکنالوجی'' میں خوب ترقی ہوتی گئی، اسی ترقی کے نتیجے میں ''انٹرنیٹ'' کی ٹیکنالوجی متعارف ہوئی۔ سب سے پہلے امریکہ کے سائنس دانوں نے ۱۹۶۰ء میں ''نیٹ ورکنگ'' کا جال بچھایا، جس کا مقصد یہ تھا کہ فوجیوں کو ضروری ہدایات اور معلومات بسرعت پہنچائی جائیں، پھر ۱۹۸۲ء میں انٹرنیٹ عالمی سطح پر کارگر ہوا، پھر ۱۹۹۱ء میں ''یورپین ہائی انرجی

فزکس لیبریٹری'' نے ایک ایسے ''سافٹ ویئر'' کوفروغ دیا، جس کی مدد سے کسی بھی طرح کی معلومات انٹرنیٹ پر تلاش کی جاسکتی تھیں، اوراس کا نام ''ورلڈ وائڈ ویب'' رکھا، اس ویب نے بہت ہی کم عرصے میں رفتہ رفتہ پوری دنیا کو اپنے دائرے میں لے لیا؛ آج پوری دنیا عموماً اسی ویب کا استعمال کرتی ہے۔ اوراسی کے ساتھ دنیا ''گلوبل ویلیج'' کی شکل اختیار کرگئی ہے۔

آج کی ترقی یافتہ دنیا میں انٹرنیٹ نے ایک خاص مقبولیت حاصل کر لی ہے، آج انسان نے انٹرنیٹ کے ذریعے پوری دنیا کو اپنی مٹھی میں لے لیا ہے، انٹرنیٹ ایک آزاد نیٹ ورک ہے، ہرکوئی گھر بیٹھے ہر قسم کی معلومات اور تجربات ومشاہدات انٹرنیٹ پر شائع کرسکتا ہے، انٹرنیٹ کی رفتار بجلی سے بھی زیادہ سریع السیر ہے، منٹوں اور سکنڈوں میں دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک کوئی بھی خبر پہنچائی جاسکتی ہے، اور دنیا کے حالات سے ہروقت باخبر رہا جاسکتا ہے؛ گویا انٹرنیٹ عالمی سطح پر پھیلا ہوا ایک لمبا جال ہے، جو انسانی زندگی کا ایک اہم اور لازمی حصہ بنتا جارہا ہے۔ یہ ایسا جال ہے جس میں کروڑوں کمپیوٹر ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور جب آپ اپنا کمپیوٹر انٹرنیٹ سے جوڑتے ہیں تو آپ بھی اس جال کا ایک حصہ بن جاتے ہیں اوراب آپ اس جال سے جڑے ہوئے دوسرے کمپیوٹر سے معلومات حاصل کرسکتے ہیں اور بھیج سکتے ہیں؛ کمپیوٹر کو ٹیلی فون لائن، کیبل لائن اور سٹیلائٹ وغیرہ کے ذریعہ آپس میں ایک دوسرے سے جوڑا جاتا ہے۔ اوراب انٹرنیٹ استعمال کرنے کے لیے ''لیپ ٹاپ'' اور ''وائی فائی'' جیسی ٹیکنالوجی بھی موجود ہے اور اس سے بھی آسان اورسستی ٹیکنالوجی 2G, 3G, 4G اور 5G ہے، جس کے ذریعہ

موبائل میں بھی انٹرنیٹ استعمال کیا جاسکتا ہے، جس کو دنیا کی ایک بڑی آبادی استعمال کررہی ہے۔

انٹرنیٹ کو جب نفع وضرر کے میزان میں تولا جاتا ہے تو واضح ہوتا ہے کہ اس کے فوائد بھی کثیر ہیں اور نقصانات بھی بہت زیادہ ہیں۔ انٹرنیٹ ایک ایسا تباہ کن ''سوفٹ ویئر'' ہے، جس کے نقصانات سینکڑوں نہیں ہزاروں ہیں، آج معاشرے میں فحاشی و بے حیائی کو عام کرنے میں انٹرنیٹ کلیدی کردار ادا کر رہا ہے، فحاشی وعریانی سے لبریز ہزاروں ''ویب سائٹیں'' انٹرنیٹ پر موجود ہیں، اور نوجوان نسل ان ویب سائٹوں سے جنسی تسکین حاصل کرتے ہیں؛ انٹرنیٹ پر موجود فلمی ڈرامے اور گانوں نے انسانی ذہنوں پر ایک عجیب کیفیت مسلط کردی ہے، ''یوٹیوب'' وغیرہ پر فحاشی وعریانی اور جنسی انارکی پر مشتمل ایسا کثیر مواد موجود ہے، جس سے نوجوانوں کی زندگیاں تباہ ہورہی ہیں؛ ''فیس بک'' اور ''واٹس ایپ'' وغیرہ نے ناجائز تعلقات کے راستے کھول دیئے ہیں، جس سے نہ صرف اخلاقی اقدار کی دھجیاں اڑائی جارہی ہیں، بلکہ جنسی آوارگی کے تمام سامان مہیا ہوگئے ہیں؛ ''سوشل میڈیا'' کا استعمال بچوں اور نوجوانوں کو نشے کی لت کی طرح لگتا جارہا ہے؛ امریکی نوجوان طالب علم ''مارک زکربرگ'' نے ''ہارڈ ورڈ یونیورسٹی'' میں اپنے دوستوں سے رابطے کے لیے ''فیس بک سافٹ ویئر'' بنایا تھا، پھر اس نے چند ہی دن میں پوری ''برطانیہ'' میں مقبولیت حاصل کرلی اور پھر رفتہ رفتہ پوری دنیا میں پھیل گیا، اس وقت ۵۴۸ رملین سے زائد افراد ''فیس بک'' کا استعمال کررہے ہیں، جن میں اکثر لوگ اس کا غلط استعمال کررہے ہیں، نئی نئی دوستیاں صنف مخالف سے کی جاتی ہیں اور پھر معاملات بہت آگے تک

چلے جاتے ہیں، جس کے مشاہدات آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اس انٹرنیٹ کے غلط استعمال کی بدولت نہ جانے کتنے نوجوانوں نے اپنی ماؤں، بہنوں اور حقیقی رشتے داروں کے ساتھ منہ کالا کرکے شرم وحیا کا پردہ چاک کیا ہے، کتنے لوگوں نے اپنے گھریلو افراد کے ساتھ غلط تعلقات قائم کرکے انسانیت کی بدترین مثال پیش کی ہے، انٹرنیٹ کے غلط استعمال سے جنسی بے راہ روی، فحاشی وعریانیت اور ہر طرح کی بدکاری معاشرے میں ناسور کی طرح پھیلتی جارہی ہے۔ جھوٹی خبریں، افواہیں اور غلط پروپیگنڈے انٹرنیٹ کے ذریعہ عام کیے جاتے ہیں، جو معاشرے میں بدامنی اور فساد کا سبب بنتے ہیں۔ اسی طرح انٹرنیٹ کے مہلک نقصانات میں بت پرستانہ ومشرکانہ رسوم، معاشی دھاندلیاں، رقومات کی ناجائز منتقلی، ذاتی معلومات کی فریب دہی، جلد دولت مند بننے کے نشے میں دھوکہ دہی اور حرام کاروبار، فریب دہی کے نئے نئے طریقے، دھمکی آمیز پیغامات اور فحش مواد کی ترسیل واشاعت وغیرہ بھی بڑے پیمانے پر شامل ہے۔

انٹرنیٹ کے جہاں تباہ کن نقصانات ہیں، وہیں اس کے فوائد بھی ہیں، اس کی اہمیت اور افادیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے؛ گویا انٹرنیٹ برائیوں اور خوبیوں کا سنگم ہے۔ ہم انٹرنیٹ کے ذریعے ای میل، ای کامرس، ای بزنس، فائل ٹرانسفر، آن لائن تعلیم، تعلیمی اداروں اور کمپنیوں کی معلومات، اخبار ورسائل اور فلاحی وزرعی تنظیموں کی جانکاری، طبی وسائنسی معلومات وتحقیقات، بینکنگ اور تمام طرح کے بلوں کی ادائیگی کرسکتے ہیں؛ اور آج کے دور میں انٹرنیٹ نے اہل علم کے لیے بھی بڑی سہولیات پیدا کردی ہیں، بہت سی وہ نایاب کتابیں جن

کا حصول دشوار ہے اور جن تک رسائی انتہائی مشکل ہے، انٹرنیٹ نے ہمیں گھر بیٹھے وہ سب کتابیں، مسودات، دستاویزات اور مخطوطات بسہولت مہیا کر دیے ہیں؛ مکتبہ جبریل اور مکتبہ شاملہ وغیرہ نے محققین کے کاموں کو نہایت آسان کر دیا ہے۔ دینی امور کے لیے بھی انٹرنیٹ کا استعمال کیا جا سکتا ہے، اور معاشرے میں ایک صالح انقلاب لایا جا سکتا ہے؛ صرف انگلی کی ایک جنبش سے دینی پیغامات اور شرعی مسائل وغیرہ کروڑوں انسانوں تک پہنچائے جا سکتے ہیں۔

جب کوئی چیز برائی اور خوبیوں کا سنگم ہو تو ظاہر سی بات ہے کہ خوبیوں والا پہلو اختیار کرنے میں ہی بھلائی اور کامیابی ہے، ہر چیز کا استعمال کارآمد تب ہی ہو سکتا ہے جب اس کو استعمال کرنے والا اپنی استعداد اور شئے کی افادیت کے اعتبار سے کام میں لائے۔ بیمار کو دوا سے شفا تب ہی مل سکتی ہے جب اس کا استعمال صحیح وقت اور ٹھیک مقدار میں ہو؛ اللہ تعالی نے ہر ذی شعور کو سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتوں سے نوازا ہے، جو لوگ مثبت اور تعمیری سوچ رکھتے ہیں اور اپنی سوچ کو اعلی مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں وہ یقیناً کامیاب ہوتے ہیں۔ اس لیے ہم یہ نہیں کہتے کہ انٹرنیٹ سے کلی طور پر کنارہ کشی اختیار کی جائے بلکہ مثبت طریقے پر اس کا استعمال کریں، اس سے فائدہ اٹھائیں، تعمیری کام اور جائز مقاصد کے حصول کے لیے اس کو استعمال میں لائیں، اس کو سماجی اصلاح کا ذریعہ بنائیں، اس کے ذریعے مفید چیزیں اور اسلامی پیغامات و احکامات دوسروں تک پہنچائیں، دینی مسائل عام کریں؛ اللہ تعالی ہمیں حدود میں رہ کر ''انٹرنیٹ ٹیکنالوجی'' سے فائدہ اٹھانے کی توفیق مرحمت فرمائے۔

سلام اس پر کہ جس نے زخم کھا کر پھول برسائے

فتح مکہ کا زمانہ چل رہا ہے، عرب میں ایک عظیم انقلاب برپا ہو رہا ہے، اہل اسلام عظیم طاقت بن کر ابھر رہے ہیں، مسلمانوں کے حق میں فتح و کامرانی کا سورج طلوع ہو رہا ہے اور اس پوزیشن میں ہو رہے ہیں کہ اب کفار مکہ کو ان کے مظالم کا مزہ چکھائیں گے، ان سے ہر ظلم و ستم کا بدلہ لیں گے، مکہ مکرمہ میں اسلامی علم لہرائیں گے، ہر مسلمان جذبۂ انتقام سے سرشار ہے، سینوں میں انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے، اور جوش انتقام میں بار بار زبان پر یہ الفاظ آ رہے ہیں: **الیوم نضربکم علی تنزیله، ضربا یزیل الهام عن مقیله، ویذهل الخلیل عن خلیله** (ترمذی رقم ۷۸٦۷) آج ہم تمہیں ایسی مار ماریں گے کہ تمہاری کھوپڑی سر سے الگ ہو جائے گی اور تم اپنے دوست و احباب کو بھی بھول جاؤ گے۔

سپاہیوں کی اس درجہ حوصلہ مندی اور جرأت مندانہ کلمات پر فاتحِ مکہ کو تو آگ بگولہ ہو جانا چاہیے تھا، کیوں کہ سربراہان مملکت کا یہی دستور رہا ہے کہ فوج کے حوصلے اور جرأت کو دیکھ کر سینہ آگ سے بھڑک اٹھتا ہے؛ قرآن کریم کہتا ہے: **ان الملوك اذا دخلوا قریة افسدوها وجعلوا اعزة اهلها اذلة** (سورہ نمل ۳٤) بادشاہ جب فاتح بن کر کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اس بستی

کےنظم وانتظام کوتباہ وبرباد کردیتے ہیں،اس علاقے کے باعزت لوگوں کوذلیل و رسوا کرکے ذلت وخواری کا پرچم ان کے ہاتھوں میں تھمادیتے ہیں، یہی حکام عالم کادستوراورطوروطریقہ رہاہے۔

لیکن وہ بادشاہ جس پرظلم وستم کے پہاڑتوڑے گئے تھے، مکہ اور طائف کی گلیوں میں جس کولہولہان کیا گیا تھا، جس کے راستوں میں کانٹے بچھائے گئے تھےاور ہرطرح سےاس کوستایا گیا تھا؛ظلم وجبر کی تمام کہانیوں کوپس پشت ڈال کر،تواضع وانکساری کو سینے سے لگائے ہوئے، اخوت ومحبت اورعفو درگزر کی ایک عظیم مثال قائم کرتے ہوئےاورامن وسلامتی کاپرچم لہراتے ہوئے مکہ میں داخل ہوتا ہے؛ کفارقریش آپ کےسامنے آئے،شرماتے ہوئے،سہمے ہوئے، ڈرے ہوئے؛ رحمت عالم نے قریش مکہ سے مخاطب ہوکرفرمایا: **یا معشر قریش! ما ترون اني فاعل فیکم** (فتح الباری) اےقریشیو!تم جانتے ہومیں آج تمہارےساتھ کیاسلوک کروں گا؟

کہنے لگے کہ: اے اللہ کےرسول! ہم نے آپ جیساحلیم وبردبارنہیں دیکھا،کسی انسان کورتبےاورمرتبے میں آپ کےہم پلہ نہیں پایا،آپ کی شرافت ضرب المثل ہےاورشریفوں سےشرافت کی ہی توقع رکھی جاتی ہے، اس لیے ہمیں آپ سے خیرومعافی کی امید ہے۔لیکن دل اندرسےکہہ رہے تھے کہ آج جان کی خیرنہیں، ہمارے ایک ایک ظلم کا بدلہ لیا جائے گا،آج ایک ایک مسلمان شہید کےخون کے بدلے کادن ہے،ہمیں اپنے کرتوتوں کی سزا بھگتنی ہی پڑے گی، ابوجندل کی پیٹھ سے لےکر بلال حبشی کے سینے تک کتنے جسم ہیں جن کوہم نےنہیں چھیدا؟نہیں تپایا؟نہیں داغا؟ہمارےہی ظلم وستم کےسبب محمد بن عبداللہ

کو گھر سے بے گھر ہونا پڑا تھا، ہمارے ہی سردار ابوسفیان کی بیوی نے محمد کے پیارے چچا ''حمزہ'' کا کلیجہ چبایا تھا، اور ابن قمیہ ہمیں میں سے تھا جس نے دریتیم آمنہ کے چہرے کو لہولہان کیا تھا۔

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم ظلم وستم کی ہر کہانی کو بھلا کر کہتے ہیں: **الیوم یوم المرحمۃ، الیوم یوم بر ووفاء** (البدایہ والنہایہ) لوگو! آج معافی کا دن ہے، رحم وکرم کا دن ہے، آج احسان و وفا کا معاملہ کیا جائے گا؛ **لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا فانتم الطلقاء** (فتح الباری) آج تم سے کوئی پوچھ گچھ نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔

سلام اس پر کہ اسرار محبت جس نے سکھلائے
سلام اس پر کہ جس نے زخم کھا کر پھول برسائے

بس یوں سمجھیے! قاتلوں کو پھانسی کے تختے پر چڑھا کر اتار دیا گیا، تلواریں گردن کے قریب لا کر روک دی گئیں، موت کا فرشتہ حلقوم کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا چکا تھا کہ اسے تھما دیا گیا؛ انسانیت کی پوری تاریخ عفو و درگزر اور اخوت ومحبت کی اس مثال سے خالی ہے۔ کسی مبالغے کے بغیر پوری دیانت اور کمال ذمہ داری کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسی جامع شخصیت تاریخ وسیر میں کہیں نظر نہیں آتی، آپ کا پیغام ملکوں اور خطوں سے نکل کر ایک عظیم انقلاب کی شکل میں رونما ہوا، اور اس پیغام سے پوری دنیا گونج اٹھی، قوموں کی تقدیریں بدل گئیں، غلام تک پستیوں سے نکل کر شہہ نشینوں پر جا بیٹھے؛ یہ انقلاب چہروں اور صورتوں کا نہیں، فکر ونظر اور ضمیر و باطن کا انقلاب تھا، جس نے چوروں اور لٹیروں کو بھی انتہائی دیانت دار اور امن پسند بنا دیا، اس

نے دشمنوں کو بھی اپنے گلے لگایا، صالح تمدن اور پاکیزہ معاشرے کی بنیاد ڈالی۔

آپ کی حیات طیبہ کھلی ہوئی ایک روشن کتاب ہے، قلم ہزاروں سطریں بھی کاغذ پر منتقل کردے تب بھی آپ کے کسی ایک وصف کی مکمل تصویر نہیں کھینچ سکتی۔ اگر دل کی آنکھیں بالکل بے نور ہو جائیں تو اس کا کوئی علاج نہیں، ہاں اگر دل میں درد اور طبیعت میں احساس ہو، چشم بصیرت میں ذرا سی بھی روشنی موجود ہو، تو آپ کی زندگی کو پڑھنے والا یہ کہنے پر مجبور ہو جائے گا اور اس کا دل خود بخود کہہ اٹھے گا کہ بس یہی زندگی حق وصداقت، پیار ومحبت، عفو ودرگزر اور اخوت و بھائی چارگی کا آخری معیار ہے۔

چھبیس جنوری؛ یوم نفاذ آئین ہند

ہندوستانیوں کی مسلسل آزادئ ہند کی جدو جہد کے نتیجے میں جب انگریزی حکومت کی جڑیں کمزور ہوگئیں اور انہوں نے محسوس کرلیا کہ اب ہم یہاں اپنی آخری سانسیں گن رہے ہیں، تو انہوں نے ہندوستانیوں کے ہاتھ میں باگ ڈور دینے کا اعلان کر دیا؛ چناں چہ ۲/ستمبر ۱۹۴۶ء کو ''پنڈت جواہر لال نہرو'' کی سرکردگی میں عارضی طور پر قومی حکومت بنائی گئی، جس کے بارہ وزیر مقرر ہوئے۔ جب عارضی حکومت قائم ہوگئی تو اب ضروری ہوگیا کہ اس کو چلانے کے لیے آئین اور دستور تیار کیا جائے۔ چناں چہ اس سلسلے میں ارباب علم و دانش کی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی، جس کے چیئر مین ''ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر'' بنائے گئے؛ آئین ساز اسمبلی میں دوسرے اراکین کے ساتھ آئین سازی کے عمل میں مسلمان اراکین نے بھی حصہ لیا، ان میں مولانا ابوالکلام آزاد، بیرسٹر آصف علی، خان عبد الغفار خاں، محمد سعد اللہ، عبد الرحیم چودھری، بیگم اعزاز رسول اور مولانا حسرت موہانی وغیرہ شامل تھے۔

۹/دسمبر ۱۹۴۶ء کو ''دستور ساز اسمبلی'' کا پہلا اجلاس بلایا گیا، پھر ۱۳/دسمبر ۱۹۴۶ء کو دوبارہ اجلاس بلایا گیا، پھر ۲۰/جنوری ۱۹۴۷ء کو تیسرا اجلاس بلایا گیا اور آئین ہند مرتب کرنے پر باضابطہ غور وخوض شروع ہوا؛ جس میں سب

سے اہم پہلو یہ تھا کہ اس ملک کا آئین اور دستور کیسا ہو؟ کون سا قانون یہاں نافذ کیا جائے؟

پھر جب ۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان مکمل طور پر آزاد ہو گیا، ۱۴ اور ۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء کی درمیانی شب میں ''آئین ساز اسمبلی'' کے اجلاس میں ''وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن'' کو ہندوستان کا گورنر جنرل منتخب کر لیا گیا اور اس حیثیت سے انہوں نے ''جواہر لال نہرو'' کو ہندوستان کے اولین وزیر اعظم کا حلف دلا دیا، ان کی مجلس وزرا کے دوسرے اراکین کو بھی حلف دلا دیا گیا اور مرکز میں عارضی حکومت کی جگہ مستقل حکومت قائم ہو گئی؛ اب ''دستور ساز اسمبلی'' اپنے کام میں تیزی لائی اور پوری آزادی کے ساتھ دستور بنانے کی جدوجہد کی گئی۔ طریقۂ کار یہ تھا کہ ایک قانون لکھا جاتا، پھر مختلف زاویوں سے اس پر غور وخوض کیا جاتا، اعتراضات وجوابات کے مراحل سے گزار کر اسے جامعیت کے زیور سے آراستہ کیا جاتا، اسے ہر نقص وکمی سے پاک کیا جاتا؛ ایسی دفعات لکھی جاتیں جو ہر ہندوستانی کو انصاف، تحفظ اور امن وسکون فراہم کر سکیں۔ کام چوں کہ بہت نزاکت ولطافت کا حامل تھا، جسے بغیر غور وخوض کے کر دینا قرین مصلحت بھی نہیں تھا، اس لیے اس کی تکمیل میں کئی سال لگ گئے؛ اور اس بیچ انگریزی قانون ہی جاری رہا۔ ۲؍سال ۱۱؍مہینے اور ۱۸؍دن کی مسلسل محنت اور دستور ساز اسمبلی کے بارہ اجلاس بلانے کے بعد بالآخر ۲۶؍نومبر ۱۹۴۹ء کو دستور تیار ہو گیا، قانون کا کاروانِ سفر اپنی منزل مقصود تک پہنچ گیا اور آئین ساز کمیٹی نے اپنا یہ مسودہ حکومت کو سونپ دیا۔ یہ دستور دنیا کے تمام دستوروں کے مقابلے میں سب سے بڑا تھا، اس میں ۳۹۵؍دفعات اور ۸؍شیڈول تھے، بعد میں وقتاً فوقتاً اس میں

ترمیمیں ہوتی رہیں، اب یہ آئین ۴۰۴/ دفعات اور ۱۲/ شیڈول پر مشتمل ہے۔

''آئین ہند'' تیار ہونے کے بعد مسئلہ یہ تھا کہ اس کو کب نافذ کیا جائے؟ چوں کہ ۲۶/ جنوری ۱۹۳۰ء میں ہندوستان کے لوگوں نے اپنے آپ کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کا عہد کیا تھا اور ہر سال چھبیس جنوری کو یہ عہد دوہرایا جاتا تھا، اس لیے طے پایا کہ اگلے سال ۲۶/ جنوری ۱۹۵۰ء کو دستور نافذ کیا جائے۔ چناں چہ ۲۱/ جنوری ۱۹۵۰ء کو دستور ساز اسمبلی کا آخری اجلاس بلا کر ۲۶/ جنوری ۱۹۵۰ء کو آئین ہند نافذ کر دیا گیا، جس میں ہندوستان کو ایک جمہوری ملک قرار دیا گیا، کیوں کہ اس کی آزادی کے حصول میں درپیش مصائب و مشکلات میں بلاتفریق سبھی مذاہب و برادری کے افراد شریک تھے اور ان تمام مجاہدین آزادی کا خواب اور خیال تھا کہ ہم سب مل کر ایسے بھارت کی تعمیر کریں گے اور ایک ایسا ملک بسائیں گے جس میں کالے، گورے، ادنی، اعلی، ہندو مسلم، برہمن، دلت، سید، انصاری، پٹھان اور شیخ وغیرہ کا بھی کوئی امتیازی فرق نہ رہے گا؛ کسی کو ذات اور مذہب کے بنیاد پر کوئی فوقیت نہیں دی جائے گی اور اس ملک کی تعمیر و ترقی اور اس کو پروان چڑھانے میں سبھی برابر کے شریک رہیں گے۔ چناں چہ اسی کو ملحوظ رکھ کر ہندوستان کو جمہوری ملک بنایا گیا اور اس کے آئین میں بلا تفریق سبھی اقوام و مذاہب کو مساوات کا درجہ، تحفظ، مذہبی آزادی اور ہندوستان کی آزاد فضا میں آزادی کے ساتھ سانس لینے کا حق فراہم کیا گیا۔ اس کے علاوہ اس میں مرکزی حکومت کے ساتھ ہی ریاستی حکومتوں سے متعلق تفصیلات بھی واضح کر دی گئیں۔ اس میں بنیادی حقوق، بنیادی فرائض، ریاستی

پالیسی کے ہدایتی اصول، مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے مابین تعلق، صدر جمہوریہ کے ہنگامی اختیارات، سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کا نظم وانتظام اور حقوق وفرائض، پبلک سروس کمیشن، انتخابی ادارہ اور مالیاتی ادارہ جیسے اہم اداروں کی تفصیلات کی بھی وضاحت کردی گئی۔ ''آئین ہند'' میں چھ بنیادی حقوق کا پاس و لحاظ رکھا گیا (۱) برابری کا حق (۲) آزادی کا حق (۳) استحصال کے خلاف حق (۴) مذہبی آزادی کا حق (۵) تعلیمی وثقافتی حق (۶) آئینی چارہ جوئی کا حق۔

ہندوستانی سیکولرازم اور جمہوریت کا مطلب یہ ہے کہ ریاست کا اپنا کوئی مذہب نہیں ہے، یہ تمام مذاہب اور اقوام کا یکساں احترام کرے گی، مذہب اور ذات وبرادری کی بنیاد پر کسی کے ساتھ کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا اور ملک کے ہر شہری کو امن، انصاف، تحفظ، حقوق اور آزادی دی جائے گی۔

۲۴ر دسمبر ۱۹۴۹ء میں ''ڈاکٹر راجندر پرساد'' کو ہندوستان کا سب سے پہلا ''صدر جمہوریہ'' منتخب کیا گیا۔ ہندوستان کے سب سے پہلے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرساد نے ۲۶ر جنوری ۱۹۵۰ء (جس دن آئین نافذ ہوا تھا) کو تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ: ''ہماری جمہوریہ کا مقصد ہر شہری کے ساتھ انصاف کرنا، آزادی دینا، اس کے ساتھ برابری کا سلوک کرنا اور اس ملک کے باشندوں میں بھائی چارہ پیدا کرنا ہے؛ جن کے مذاہب، زبانیں اور رسم و رواج مختلف ہیں''۔ پھر ۳۱ر جنوری ۱۹۵۰ء کو ''پارلیامنٹ'' کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ ''ہندوستان کو جمہوریہ بنانے کے بعد اس کے کروڑوں انسانوں کی خدمت کا مقدس فرض ہم پر عائد ہوا ہے، آپ نے مجھے صدر بنا کر جو بوجھ میرے کندھوں پر ڈالا ہے، خدا کرے کہ میں اپنے آپ کو اس

کا اہل ثابت کرسکوں؛ اس اہم موقع پر ہمارے ذہن میں گاندھی جی کی یاد آتی ہے، انہوں نے اتحاد، دوستی اور ایک دوسرے کی بھلائی کا پیغام دیا، تاکہ ہمارے درمیان کسی قسم کا کوئی اختلاف باقی نہ رہے اور ہم ایک دوسرے کی مدد اور تعاون سے ہندوستان کو اونچا اٹھا سکیں''۔

ہر سال چھبیس جنوری کو پورے ہندوستان میں جو خوشیاں منائی جاتی ہیں اور جھنڈا لہرایا جاتا ہے، اس کا مطلب یہی ہے کہ اس دن ''آئین ہند'' نافذ ہوا تھا؛ جس میں ہندوستان کو جمہوری ملک قرار دیا گیا تھا، اسی لیے یہ دن ''یوم جمہوریہ'' کہلاتا ہے۔ اس آئین کا تحفظ ہر ایک کے لیے لازم اور ضروری ہے، اگر کوئی حکومت اس آئین اور دستور کو نظر انداز کرے گی تو یہ ملک کی بربادی کا پیش خیمہ ہوگا، اور مجاہدین آزادی کی برسہابرس کی محنتوں پر پانی پھیرنا ہوگا۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہیں ہندوستان ہمارا

ملت اسلامیہ کا ایک عظیم سرمایہ: محمد الیاس گھمن

دنیا میں بے شمار انسان ہیں، انسانوں کی اس بھیڑ میں اللہ کے بعض بندے وہ ہیں جو لوگوں کی رہنمائی اور انسانیت کی خدمت کے لیے بھیجے جاتے ہیں؛ تاریخ کے صفحات پر ایسی بہت سی ہستیاں ملتی ہیں جنہوں نے بے لوث خدمات انجام دی ہیں، حق اور باطل کے فرق کو واضح کیا ہے، امت مسلمہ کی سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کی ہے، دین کی صحیح تصویر امت کے سامنے پیش کی ہے، نبوت کی میراث کو لوگوں تک پہنچایا ہے اور آنے والی نسلوں کی صحیح دینی تعلیم وتربیت کا انتظام کیا ہے۔

آج کی دنیا میں جب نظر دوڑائی جاتی ہے تو ایک نمایاں نام حضرت مولانا ''محمد الیاس گھمن'' صاحب دامت برکاتہم کا نظر آتا ہے۔مولانا محمد الیاس گھمن ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں، آپ جہاں ایک طرف بہترین عالم دین ہیں وہیں دوسری طرف بہترین مناظر، خطیب، صحافی، ادیب، مصنف، صوفی، مرشد، فقیہ، شیخ الحدیث، متکلم اسلام، وکیل احناف، اہل سنت والجماعت کے ترجمان، عالم اسلام کے قائد ورہنما اور علمائے دیوبند کی روایات کے امین ہیں۔

آپ کی پیدائش ۱۲/اپریل ۱۹۶۹ء میں ''سرگودھا'' پاکستان میں ہوئی، آپ نے جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاون کراچی اور جامعہ نصرت العلوم

گوجرانوالہ میں تعلیم حاصل کی اور مولانا محمد سرفراز خان صفدر سے خصوصی علم حاصل کیا۔ آپ نے بہت ہی کم مدت میں بہت ہی نمایاں خدمات انجام دی ہیں، آج آپ جہاں ایک طرف ''مرکز اہل سنت والجماعت سرگودھا'' کے ناظم اور شیخ الحدیث ہیں، وہیں دوسری طرف ''عالمی اتحاد اہل سنت والجماعت'' کے امیر ہیں، احناف میڈیا سروس کے منتظم اعلی ہیں، احناف ٹرسٹ انٹرنیشنل اور خانقاہ حنفیہ سرگودھا کے سرپرست ہیں، سہ ماہی مجلہ ''قافلۂ حق'' سرگودھا کے مدیر ہیں، اسی کے ساتھ درجنوں کتابوں کے مصنف ہیں۔

مسلک اہل سنت والجماعت، علمائے دیوبند کے افکار ونظریات اور فقہ حنفی کو دنیا بھر میں پھیلانے کے لیے آپ نے بڑی قربانی پیش کی ہے، جس کے اثرات ہر جگہ محسوس کیے جا رہے ہیں۔ آپ نے اپنی زبان وقلم کے ذریعے مسلک اہل سنت والجماعت، علمائے دیوبند اور فقہ حنفی پر کیے جانے والے اعتراضات کے نہ صرف مسکت جوابات دیے ہیں بلکہ ہر مسئلے پر دلائل کے انبار لگا دیے ہیں۔ نیز ماضی قریب اور دور حاضر میں ابھرنے والے نت نئے فرقوں کا آپ نے خوب تعاقب کیا ہے اور حق وباطل کے فرق کو بخوبی واضح کیا ہے۔

آپ کا انداز گفتگو افہام وتفہیم سے بھرپور نہایت شائستہ اور شگفتہ ہے، لب ولہجہ منفرد خوبیوں کا حامل ہے، انداز تحریر اتنا البیلا اور مدلل کہ آپ کی جو بھی کتاب یا تحریر پڑھنی شروع کی جائے مکمل پڑھے بغیر چین ہی نہیں آتا؛ آپ کا انداز تدریس بھی بڑا نرالا ہے، دنیا بھر کے لوگ آپ کے دروس سے استفادہ کرتے ہیں؛ آپ کے ذریعے چلایا جانے والا ''دورۂ تحقیق المسائل'' اور دیگر کئی سارے جدید ''کورس'' ایک ایسا تعلیمی سلسلہ ہے، جس سے ہر سال ہزاروں اور

لاکھوں طالبان علوم نبوت استفادہ کرتے ہیں۔

قلم ہزاروں سطریں بھی کاغذ پر منتقل کردے تب بھی آپ کی حیات و خدمات، سیرت وشخصیت اور اوصاف وکمالات کی مکمل تصویر نہیں کھینچ سکتی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالی آپ کی خدمات قبول فرمائے، اور امت مسلمہ پر آپ کا سایہ تادیر قائم ودائم فرمائے۔

اولیات عمر رضی اللہ عنہ

خلیفۂ دوم سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا اصل نام عمر، کنیت ابوحفص اور لقب فاروق ہے۔ والد کا نام خطاب اور والدہ کا نام ختمہ ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں ثالثی اور قریش کی سفارت کاری ان کے خاندان کا امتیاز تھا۔ ہجرت نبوی سے چالیس سال پہلے پیدا ہوئے۔ آپ کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو زمانۂ جاہلیت میں لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ ذریعۂ معاش عام عربوں کی طرح تجارت تھا۔ آپ خوددار، بلند حوصلہ اور بہت زیادہ معاملہ فہم تھے، اسی لیے قریش نے ان کو اپنا سفیر بنالیا تھا؛ جب قبائل کے درمیان معاملات میں کوئی پیچیدگی ہوتی تو سفارت کے فرائض انجام دیتے۔ نبئ پاک علیہ السلام نے ابوجہل اور عمر میں سے کسی ایک کے اسلام قبول کرنے کی دعا مانگی تھی، اور اس دعا کا اثر یہ ہوا کہ حضرت عمر کچھ دنوں میں حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ ہر وقت نبی علیہ السلام کے ساتھ رہتے تھے اور آپ کے ساتھ تمام غزوات میں شریک رہے، آپ علیہ السلام ان پر بہت زیادہ اعتماد کرتے تھے۔ خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں حضرت عمر ان کے سب سے قریبی مشیر رہے۔ حضرت ابوبکر صدیق نے اپنے بعد کے لیے انہیں مسلمانوں کا امیر اور خلیفہ نامزد کر دیا تھا۔

خلافت کے نظام کا آغاز حضرت ابوبکر صدیق کے زمانے سے ہوتا ہے

اور اسے ایک ادارے کی شکل بھی ان ہی کے زمانے میں حاصل ہوئی، لیکن اس میں تنظیم اور استحکام پیدا کرنے میں سب سے نمایاں کردار حضرت عمر کا ہے۔ حضرت عمر نے اپنے ساڑھے دس سالہ دور خلافت میں وہ عظیم الشان حکومت قائم کی جو رقبہ اور طاقت دونوں اعتبار سے اپنے زمانے کی سب سے بڑی اور مستحکم حکومت تھی۔ کسی بھی حکومت کے لیے دس گیارہ سال کا عرصہ کوئی زیادہ نہیں ہے، لیکن حضرت عمر نے صرف ساڑھے دس سال کی مختصر مدت میں وہ عظیم الشان حکومت قائم کی کہ ہر طرف امن و امان کا بول بالا تھا، عدل و انصاف عام تھا، شہریوں کی تمام ضروریات کا خیال رکھا جاتا تھا۔ آپ نے اپنے دور خلافت میں حکومت کے مختلف محکمے قائم کیے، جو ''دیوان'' کہلاتے تھے۔

حکومت کے نظم و انتظام کو بہتر بنانے کے لیے آپ نے جو بھی اقدامات کیے یا جو اصلاحات نافذ کیں، انہیں اسلامی تاریخ میں ''اولیات عمر'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے؛ یعنی دنیا کی تاریخ میں وہ کام جو سب سے پہلے حضرت عمر نے کیے۔ ان میں سے کچھ ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں:

(۱) خلیفۂ اسلام کے لیے ''امیر المومنین'' کا لقب اختیار کیا، یہ لقب حضرت عمر کے بعد ہمیشہ کے لیے جاری ہو گیا۔

(۲) اسلامی کلینڈر سن ہجری کا آغاز کیا۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے سال سے شروع ہوتا ہے، اور اس کا پہلا مہینہ محرم ہے۔ اس سے پہلے دوسرے کلینڈروں سے اسلامی حکومت کا کام کاج چلتا تھا، اسلامی کلینڈر کا آغاز ۱۷ھ ہجری سے ہوا۔

(۳) حکومت کے انتظامی امور کو چلانے کے لیے آپ نے اسلامی

ریاست کوصوبوں اور ضلعوں میں تقسیم کیا، اور مختلف مقامات (صوبائی اور ضلعی مراکز) میں حکومتی امور کی نگرانی اور انجام دہی کے لیے مختلف افسران اور حکام کا تقرر کیا۔ آپ کے زمانۂ خلافت میں گیارہ صوبے تھے۔ مکہ، مدینہ، شام، جزیرہ، بصرہ، کوفہ، مصر، فلسطین، خراسان، آذربائیجان، اور فارس۔

(۴) اسلامی حکومت کی فوجی ضروریات کے پیش نظر آپ نے باضابطہ فوج کا محکمہ قائم کیا، فوج سے متعلق تمام اموراور معاملات کی دیکھ بھال اور نگرانی اس محکمے کی ذمہ داری تھی۔

(۵) اسلامی حکومت کے مالی امور کی دیکھ ریکھ کے لیے باضابطہ مالیات کا محکمہ قائم کیا، یہ محکمہ مسلمانوں اور مملکت کی دیگر رعایا سے ٹیکسوں کی وصولی کرتا تھااوران کی تقسیم کا کام بھی اسی محکمے کے ذمے تھا۔

(۶) اسلامی مملکت کے حدود میں ہر سطح پر امن وامان بحال رہے۔اس مقصد کے حصول کے لیے آپ نے ''پولیس'' کا محکمہ قائم کیا۔ اس محکمے کا نام ''احداث'' تھااوراس کا سربراہ 'صاحب الاحداث'' کہلاتا تھا۔

(۷) پوری مملکت میں عدل و انصاف کو یقینی بنانے کے لیے تمام صوبائی اور ضلعی مراکز میں عدالتیں قائم کیں، اوران میں فیصلہ کرنے کے لیے قاضی مقرر کیے۔

(۸) آپ کے زمانے میں اسلامی حکومت کی آمدنی میں بہت زیادہ اضافہ ہوا، لہذا کاموں پر مال خرچ کرنے کے بعد جواضافی مال بچ جاتا تھا، اس کومحفوظ کرنے کے لیے مدینے میں ''بیت المال'' کی عمارت تعمیر کرائی، یہ محکمہ مال کی آمدوخرچ کا حساب رکھنے کے علاوہ اس پر بھی نظر رکھتا تھا کہ مال کواصول

اور ضابطے کے تحت خرچ کیا جا رہا ہے یا نہیں؟ اور اس کی نگرانی کے لیے الگ سے ''افسر بیت المال'' کا تقرر ہوتا تھا۔

(۹) مملکت میں زراعت کی ترقی اور عشر و خراج کے نظام کو بہتر بنانے کے لیے زمین کی پیمائش کرائی۔

(۱۰) اسلامی مملکت کو حقیقی معنی میں رفاہی مملکت بنانے کے لیے مملکت کے ہر مسلمان شہری کے لیے وظیفہ مقرر کیا۔ اس زمانے میں یہ بہت بڑا انقلابی قدم تھا۔

(۱۱) وظائف کے نظام کو بہتر اور درست رکھنے کے لیے پہلی مرتبہ ''مردم شماری'' کرائی، تاکہ رعایا کے حالات پورے طور پر حکومت کے سامنے رہیں۔

(۱۲) مجرموں کو سزا دینے اور ان کی اصلاح و تربیت کے لیے ''جیل خانے'' قائم کیے۔

(۱۳) مملکت کی پوری خبریں رکھنے کے لیے تمام علاقوں میں وہاں کی خبریں حاصل کرنے کے لیے پرچہ نویس مقرر کیے۔

(۱۴) فوجوں کی بہتر مشقوں کے لیے عام شہری آبادیوں سے الگ ہٹ کر ''فوجی چھاؤنیاں'' قائم کیں۔

(۱۵) مساجد کے نظام کو بہتر بنانے کے لیے مسجدوں میں روشنی کا انتظام کرایا، امام اور مؤذن مقرر کیے اور ان کی تنخواہیں بھی مقرر کیں۔

(۱۶) مملکت میں تعلیم کو عام کرنے کے لیے مکتب اور مدرسے قائم کیے، اور تعلیم دینے والے اساتذہ کے لیے تنخواہیں مقرر کیں۔

(۱۷) تجارتی، حج اور دیگر قافلوں کی آمد و رفت کو آسان اور محفوظ بنانے کے لیے شاہ راہوں پر چوکیاں قائم کیں، اور سرائیں بنوائیں۔

(۱۸) زراعت کی ترقی کے لیے پانی کا انتظام کیا اور نہریں کھدوائیں

(۱۹) مملکت میں راستوں کو درست اور محفوظ بنایا اور سڑکیں تعمیر کرائیں

(۲۰) اشیاء اور پیغامات کی ترسیل کے لیے ڈاک کا نظام قائم کیا۔

(۲۱) غیر مسلموں کو عرب علاقوں میں تجارت کرنے کی اجازت دی۔

(۲۲) عربوں کو غلام نہ بنائے جانے کا قاعدہ مقرر کیا، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سے استنباط پر مبنی تھا۔

(۲۳) وقف کے طریقے کو منضبط کیا۔ جس میں وقف کے مصرف، اس پر تولیت اور متولی کے اختیارات کو واضح فرمایا۔ اس پہلو سے آپ کو وقف کے طریقے کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔

(۲۴) لوگوں میں اصلاح و تبلیغ کے لیے مسجدوں میں وعظ و تقریر کا طریقہ جاری کیا۔

(۲۵) امور سلطنت کی انجام دہی، فیصلے اور مشوروں کے لیے ''مجلس شوریٰ'' قائم کی؛ جس میں مہاجرین اور انصار میں سے منتخب حضرات کے علاوہ اکابر اہل رائے شامل تھے۔ تمام امور کا فیصلہ اتفاق رائے یا کثرت رائے سے ہوتا تھا، حکومت کے بڑے عہدے داروں کا انتخاب و تقرر بھی مجلس شوریٰ کرتی تھی۔ مجلس شوریٰ کے علاوہ ایک ''مجلس عام'' بھی تشکیل دی، جس میں انصار و مہاجرین کے علاوہ تمام قبیلوں کے سردار شریک تھے؛ اس مجلس کا اجلاس اس وقت طلب کیا جاتا تھا جب کوئی بہت ہی اہم مسئلہ درپیش ہو، ورنہ حکومت کے روز

مرہ کے کاموں کے لیے مجلس شوریٰ کے فیصلوں کو کافی سمجھا جاتا تھا۔ ان دونوں مجلسوں کے علاوہ ایک تیسری ''مجلس خاص'' بھی تھی، جس میں صرف مہاجر صحابہ شریک ہوتے تھے۔

(۲۶) حکام کی نگرانی کے لیے احتساب کا شعبہ قائم کیا۔ جس شخص کو بھی کوئی ذمہ داری دیتے تو اس سے عہد لیتے تھے کہ وہ ترکی گھوڑے پر سوار نہیں ہوگا، باریک کپڑا نہیں پہنے گا، چھنا ہوا آٹا نہیں کھائے گا، دروازے پر دربان نہیں رکھے گا اور ضرورت مندوں کے لیے ہمیشہ اپنے دروازے کھلے رکھے گا۔ یعنی آپ کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ حاکم بھی عام لوگوں کی طرح رہے اور اس پر اقتدار کا نشہ نہ چڑھنے پائے۔ نیز لوگوں کو حکام کے خلاف شکایت کرنے کی بھی عام اجازت تھی۔

یہ وہ چیزیں ہیں جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دنیا کے حکم رانوں کی صف میں ایک مثالی حکم راں بنا کر پیش کرتی ہیں۔ آپ نے حکم رانی کے وہ اصول اور ضابطے مقرر کیے جن پر چلنا دنیا کا ہر اچھا حکمراں اپنے لیے باعث فخر و سعادت سمجھتا ہے۔ انتظام حکومت کو بہتر اور مضبوط بنانے کے لیے وہ اقدامات اور اصلاحات کیں جو آج تک مشعل راہ بنی ہوئی ہیں، اور دنیا کی ہر حکومت ان سے رہنمائی حاصل کرتی ہے۔ آپ کے پیش نظر ہمیشہ دین اسلام اور مسلم امہ کا مفاد رہا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے دور خلافت میں اسلام اور مسلمانوں نے ہر اعتبار سے بہت تیزی کے ساتھ ترقی کی۔

(قوم کے لیے ایک اہم پیغام)

سوشل میڈیا پر کیا ہورہا ہے؟ خود کو بچاؤ!

آج کل ''سوشل میڈیا'' پر ہمارے نوجوانوں میں ایک رجحان پیدا ہوا ہے کہ وہ اسلامی طرز کے ہر آنے والے ''میسیج'' کو ثواب کی نیت سے بغیر کسی رکاوٹ اور غور وفکر کے آگے بھیج دیتے ہیں۔ اس کی صحت ودرستگی پر نہ خود غور کرتے ہیں اور نہ کسی عالم دین سے تحقیق کرنے کی زحمت گوارا کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **یا ایھا الذین آمنو ان جاء کم فاسق بنبأ فتبینوا أن تصیبوا قوما بجھالة فتصبحوا علی ما فعلتم نادمین۔** (سورہ حجرات) اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لے کر آئے تو اچھی طرح تحقیق کرلیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم نادانی سے کچھ لوگوں کو نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر اپنے کیے پر پچھتاؤ۔

مذکورہ آیت کریمہ اگرچہ ایک خاص پس منظر میں نازل ہوئی ہے، لیکن قرآن کریم کا اسلوب یہ ہے کہ اس کی آیتیں چاہیں کسی خاص موقع پر نازل ہوئی ہوں، اکثر ان کے الفاظ عام ہوتے ہیں؛ تاکہ ان سے ایک اصولی حکم معلوم ہوسکے۔ چناں چہ یہ حکم عام ہے کہ کسی بھی فاسق کی خبر پر بغیر تحقیق اعتماد نہیں کرنا

چاہیے۔آیت کے عموم کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ ہر طرح کی خبر کی پہلے تحقیق کرنی چاہیے۔

آج تحقیق اور غور وفکر کا کہیں نام ونشان نہیں ہے،جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بے سند اور من گھڑت باتیں عام ہوگئیں،اور بہت سی جھوٹی روایات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے بیان کی جانے لگیں؛ جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: **من كذب علي متعمدا فليتبوأ مقعده من النار** (رواه البخاري ۱۲۲۹ ، ورواه مسلم في مقدمة صحيحه) جو آدمی میری طرف کوئی من گھڑت بات منسوب کرے گا،تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔

پیغمبر علیہ السلام نے کس قدر وعید ارشاد فرمائی ہے! لہٰذا اپنے آپ کو ان وعیدات سے بچانے کی کوشش کریں۔ جو بھی کوئی روایت یا حدیث پاک آپ کو ''سوشل میڈیا'' پر ملتی ہے، پہلے اس کی خوب تحقیقات کرلیں کہ ایا وہ صحیح ہے یا نہیں؟ جس روایت کے بارے میں صحیح تحقیق ہو وہ آگے بھیجیں، ورنہ ایسے پیغامات آگے بڑھانے سے گریز کریں۔اللہ ہم سب کا حامی وناصر ہو۔آمین

آ عندلیب! مل کے کریں آہ وزاریاں

(مولانا نور عالم خلیل امینی کی وفات)

علماء کی شکل میں علم اٹھتا جارہا ہے، پچھلے کئی سالوں سے بڑی تیزی کے ساتھ بڑے بڑے علماء کرام اس دار فانی سے دار بقاء کی طرف رحلت فرمارہے ہیں۔ گویا ایک لڑی ہے، جو ٹوٹ گئی ہے، جس کے دانے بہت تیزی کے ساتھ بکھرتے جارہے ہیں؛ اور حضور علیہ الصلاۃ والسلام کی پیش گوئی آنکھوں سے دیکھنے کو مل رہی ہے۔

خبر ہے کہ حضرت مولانا نور عالم خلیل امینی صاحب ۲۰/ رمضان المبارک ۱۴۴۲ھ مطابق ۳/ مئی ۲۰۲۱ء بروز پیر بوقت فجر اس دار فانی کو الوداع کہہ گئے ہیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ آپ کی وفات کی خبر سے بے حد دکھ اور افسوس ہوا، یہ یقیناً علمی دنیا کے لیے ایک المناک سانحہ ہے، لیکن ہم تقدیر کے فیصلوں پر راضی ہیں۔

مولانا کی شخصیت سے کون ناواقف ہے؟ علمی و ادبی دنیا میں آپ کا ایک نمایاں مقام ہے۔ ۱۹۵۲ء میں ضلع ''مظفر پور'' بہار میں آپ کی پیدائش ہوئی۔ آپ نے مدرسہ امدادیہ دربھنگہ، دارالعلوم مؤ، دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ امینیہ دہلی سے تعلیم حاصل کی؛ علوم اسلامیہ میں فضیلت اور عربی زبان و ادب

میں تخصص کیا۔تقریباً دس بارہ سال ''دارالعلوم ندوۃ العلماء'' میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۸۲ء میں ''دارالعلوم دیوبند'' میں آپ کا تقرر ہوا اور پھر تاحیات (تقریبا چالیس سال) دارالعلوم دیوبند میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ساتھ ہی دارالعلوم دیوبند سے نکلنے والے عربی مجلہ ''الداعی'' کی ادارت کی۔مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا وحیدالزماں کیرانوی کے آپ حقیقی علمی وارث تھے اور ان دونوں بزرگوں کی ترجمانی کرتے تھے۔عربی زبان و ادب میں نمایاں خدمات اور ممتاز مقام کے اعتراف میں سال ۲۰۱۷ء میں آپ کو ''صدارتی اعزازی سند'' کے لیے نامزد کیا گیا، اور ۲۰۱۹ء میں ''صدر جمہوریہ ہند'' کی طرف سے ''ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔

طبیعتا نازک خیال، اصول پسند اور خوددار انسان تھے، زبان وقلم انتہائی شائستہ وشگفتہ تھی، زبان وبیان اور املا کا بہت خیال رکھتے تھے، اردو اور عربی کے بڑے ادیبوں میں آپ کا شمار تھا، آپ نقاد، سوانح نگار، تذکرہ نویس، خاکہ نگار، مقالہ نگار اور درجنوں کتابوں کے مصنف ومترجم تھے۔

دارالعلوم دیوبند میں طالب علمی کے دوران جب ان کی کتاب ''کیا اسلام پسپا ہورہا ہے؟'' ہاتھ لگی، تو بس ان کے قلم اور تحقیقات کا اسیر ہوگیا؛ پھر انکی کئی ساری کتابیں ''صلیبی صہیونی جنگ''، ''پس مرگ زندہ'' اور ''حرف شیریں'' وغیرہ لائبریری سے نکالیں اور بس مطالعہ شروع کردیا۔مولانا کی کتابیں پڑھ کر مجھے بہت کچھ حاصل ہوا اور لکھنے کا سلیقہ پیدا ہوا۔میں نے کئی شخصیات پر مقالے ان کی کتاب ''پس مرگ زندہ'' سے رہنمائی حاصل کرکے لکھے۔تعبیرات اخذ کیں، الفاظ اخذ کیے اور لکھنے کا سلیقہ اور انداز حاصل کیا۔

تدریسی مشغلہ،ملکی و بیرونی اسفار اور ذاتی مصروفیات کے باوجود آپ لکھنے کے بے حد شوقین تھے؛ جس کے نتیجے میں درجنوں اردو اور عربی تصانیف وجود میں آئیں۔ چند اردو تصانیف یہ ہیں: وہ کوہ کن کی بات (مولانا وحید الزماں کیرانوی کی سوانح حیات)، فلسطین کسی صلاح الدین ایوبی کے انتظار میں، پسِ مَرگ زندہ، حرفِ شیریں، صلیبی صہیونی جنگ، کیا اسلام پسپا ہو رہا ہے؟، خط رقعہ کیوں اور کیسے سیکھیں؟ وغیرہ۔ چند عربی تصانیف یہ ہیں: **مفتاح العربیہ، المسلمون في الهند، الصحابة و مكانتهم في الإسلام، مجتمعاتنا المعاصرة والطريق إلى الإسلام، الدعوة الإسلامية بين الأمس واليوم، متى تكون الكتابات مؤثرة؟ تعلّموا العربية فإنها من دينكم، العالم الهندي الفريد الشيخ المقرئ محمد طيب، من وحي الخاطر، فلسطين فى انتظار صلاح الدين،** (اس کتاب پر آسام یونیورسٹی میں ''پی ایچ ڈی'' مقالہ بھی لکھا گیا ہے) وغیرہ۔اس کے علاوہ اردو اور عربی میں بے شمار مقالے اور مضامین لکھے، جو ملک و بیرون ملک مختلف رسالے، مجلّات اور اخبارات وغیرہ میں شائع ہوئے؛ تقریباً ۳۵/اردو کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا۔ حالات پر آپ کی بہت گہری نظر تھی، عالم اسلام اور صلیبیت وصہیونیت کو آپ نے بہت قریب سے دیکھا تھا،جس کے نمونے آپ کی تصانیف میں بخوبی دیکھنے کو ملتے ہیں۔

راوی کے مطابق زندگی کے آخری ایام میں آپ نے اپنے چھوٹے فرزند ''ثمامہ نور'' کو بلا کر کچھ درد بھرے جذباتی اشعار سنائے اور پھر رونے لگے۔فرمایا:

آشیاں جل گیا، گلستاں لٹ گیا، ہم قفس سے نکل کر کدھر جائیں گے
اتنے مانوس صیاد سے ہو گئے، اب رہائی ملے گی تو مر جائیں گے

اور کچھ دن یہ دستور مے خانہ ہے، تشنہ کامی کے یہ دن گزر جائیں گے
میرے ساقی کو نظریں اٹھانے تو دو، جتنے خالی ہیں سب جام بھر جائیں گے

اے نسیم سحر تجھ کو ان کی قسم، ان سے جا کر نہ کہنا مرا حال غم
اپنے مٹنے کا غم تو نہیں ہے مگر، ڈر یہ ہے ان کے گیسو بکھر جائیں گے

اشک غم لے کے آخر کدھر جائیں ہم، آنسوؤں کی یہاں کوئی قیمت نہیں
آپ ہی اپنا دامن بڑھا دیجیے، ورنہ موتی زمیں پر بکھر جائیں گے

کالے کالے وہ گیسو شکن در شکن، وہ تبسم کا عالم چمن در چمن
کھینچ لی ان کی تصویر دل نے مرے، اب وہ دامن بچا کر کدھر جائیں گے

احادیث رسول کے مطابق رمضان المبارک میں انتقال کرنے والوں کی خصوصی فضیلت ہے۔ پھر بھی ہم بارگاہ رب العالمین میں دعا کرتے ہیں کہ اللہ پاک مولانا کو غریق رحمت فرمائے، بال بال مغفرت فرمائے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے؛ اہل خانہ، جملہ عزیز واقارب اور متعلقین ومتوسلین کو صبر جمیل عطا فرمائے اور امت مسلمہ کو آپ کا نعم البدل عطا فرمائے۔

فلسطین اور اسرائیل

(تاریخی حیثیت، عالمی سازش اور فسادی دور)

فلسطین دنیا کے قدیم ترین مما لک میں سے ہے۔ یہ اس علاقے کا نام ہے جو ''لبنان'' اور ''مصر'' کے درمیان ہے۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ عربستان سے ''قبیلہ سام'' کی ایک شاخ جو ''کنعانی'' یا ''فونیقی'' کہلاتی تھی، ۲۵۰۰ر قبل مسیح میں اس خطے میں آ کر آباد ہوئی۔ پھر آج سے ۴۰۰۰ر سال پہلے یعنی لگ بھگ ۲۰۰۰ر قبل مسیح میں حضرت ابراہیم علیہ السلام عراق کے ایک شہر سے جو دریائے ''فرات'' کے کنارے آباد تھا، ہجرت کر کے یہاں آباد ہوئے؛ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے ایک بیٹے اسحاق علیہ السلام کو ''بیت المقدس'' میں جب کہ دوسرے بیٹے اسمٰعیل علیہ السلام کو ''مکہ مکرمہ'' میں آباد کیا۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے حضرت یعقوب علیہ السلام تھے، جن کا نام ''اسرائیل'' بھی تھا؛ ان کی اولاد بنی اسرائیل کہلائی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت یحییٰ علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بہت سے دیگر پیغمبر اسی سرزمین میں پیدا ہوئے یا باہر سے آ کر یہاں آباد ہوئے، اس مناسبت سے زمین کا یہ خطہ پیغمبروں کی سرزمین کہلایا۔

فلسطین کا ایک بہت معزز شہر ہے، جو دنیا کا قدیم ترین شہر ہے، جس کا عربی نام ''القدس'' ہے اور قدیم مصنفین عام طور پر اس کو ''بیت المقدس'' لکھتے ہیں؛ یہ دنیا کا واحد شہر ہے جو یہودیوں، مسیحیوں اور مسلمانوں کے لیے یکساں مقدس ومحترم ہے۔ یہ شہر پہاڑیوں پر آباد ہے اور انہی پہاڑیوں میں سے ایک کا نام ''کوہ صیہون'' ہے، جس پر ''مسجد اقصیٰ'' اور ''قبۃ الصخرۃ'' واقع ہیں۔ کوہ صیہون کے نام پر ہی یہودیوں کی عالمی تحریک ''صیہونیت'' قائم کی گئی۔ عبرانی زبان میں اس شہر کا نام ''یروشلم'' ہے اور آج کل یروشلم ہی کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔ یہ نام حضرت داؤد علیہ السلام نے رکھا تھا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے ۱۰۰۴ر قبل مسیح سے ۹۶۵ر ق م تک ۳۹ر سال یہاں حکم رانی کی۔ ان کے بعد ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام نے ۹۶۵ر ق م میں حکومت سنبھالی، جو ۹۲۶ر قبل مسیح تک قائم رہی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد ''اسرائیل'' کی متحدہ ریاست دو حصوں ''سامریہ'' اور ''یہودیہ'' میں تقسیم ہوگئی۔ دونوں ریاستیں ایک عرصے تک باہم دست وگریبان رہیں۔ ۵۹۸ر قبل مسیح میں ''بابل'' کے بادشاہ ''بخت نصر'' نے حملہ کرکے یروشلم سمیت تمام علاقوں کو فتح کرلیا اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا کر بادشاہ اور ہزاروں شہریوں کو گرفتار کرکے بابل میں قید کردیا۔ پھر ۵۳۹ر قبل مسیح میں ایران کے بادشاہ ''خسرو'' نے بابل کو فتح کیا اور قیدیوں کو رہا کرکے واپس یروشلم بھیج دیا۔

۳۳۲ر قبل مسیح میں یروشلم پر ''سکندر اعظم'' نے قبضہ کرلیا۔ پھر ۱۶۸ر قبل مسیح میں یہاں ایک یہودی بادشاہت کا قیام عمل میں آیا، لیکن اگلی صدی میں

''روما'' کی سلطنت نے اسے زیرنگین کرلیا؛ ۱۳۵ رقبل مسیح اور ۷۰ رقبل مسیح میں یہودی بغاوتوں کو کچل دیا گیا۔اس زمانے میں اس خطے کا نام ''فلسطین'' پڑ گیا۔

۲۰ راگست ۶۳۶ءکوعرب فاتحین نے فلسطین کو فتح کیا۔ یہ قبضہ پرامن طریقے سے عمل میں آیا۔اور پھر ۶۴۳ رسال تک یہاں عرب،عربی زبان اور اسلام کا دور دورہ رہا۔ اور یہودی ایک اقلیت کی حیثیت سے موجود رہے۔ پھر گیارہویں صدی عیسوی کے بعد یہ علاقہ غیر عرب سلجوق، مملوک اور عثمانی سلطنتوں کا حصہ رہا۔ ۱۱۸۹ء میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس کو فتح کیا اور یہاں پھر مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی۔پھر چار صدیوں تک عثمانیوں کی حکم رانی کے بعد ۱۹۱۷ء میں ''برطانیہ'' نے اس خطے کو اپنی تحویل میں لے لیا اور فوری اعلان کے ذریعہ یہودیوں کے لیے ایک قومی ریاست کے قیام کا وعدہ کیا۔

فلسطین کی جانب یہودیوں کی نقل مکانی ۱۷ویں صدی عیسوی کے اواخر میں شروع ہوگئی تھی۔اور ۱۹۳۰ءتک ''نازی جرمنی'' کے یہودیوں پر مظالم کی وجہ سے اس میں بہت اضافہ ہوا۔ ۱۹۲۰ء، ۱۹۲۱ء، ۱۹۲۹ءاور ۱۹۳۶ء میں عربوں کی طرف سے یہودیوں کی نقل مکانی اور اِس علاقے میں آمد کے خلاف پرتشدد مظاہرے بھی ہوئے،لیکن یہ سلسلہ جاری رہا۔

۱۹۴۷ء میں ''اقوام متحدہ'' کی ''جنرل اسمبلی'' نے ایک قرارداد کے ذریعے ''فلسطین'' کو تقسیم کرکے ایک عرب اور ایک اسرائیلی ریاست قائم کرنے کا اعلان کیا۔ برطانیہ نے ۱۹۴۸ء میں اس علاقے سے اپنی فوجیں واپس بلالیں اور ۱۴رمئی ۱۹۴۸ءکو اسرائیل کی آزاد حکومت کے قیام کا اعلان کردیا گیا۔اس

طرح فلسطین کے کچھ علاقوں کو لے کر دنیا کے نقشے پر اسرائیل نامی ریاست وجود میں آئی۔

اس کے بعد ایک نیا دور شروع ہوتا ہے، جس کو عالمی فسادی دور کہا جاسکتا ہے؛ اسرائیل نامی ریاست پھیلتی چلی گئی اور ظلم وستم کی تمام حدود پار کرتے ہوئے فلسطین کے علاقوں پر قبضہ کرتی چلی گئی، حتیٰ کہ اس کے اکثر علاقے بزور طاقت ہڑپ لیے؛ عالمی طاقتوں نے اس خطے کو اپنا مرکز سیاست بنایا، اور ایسی خانہ جنگی پیدا کی گئی کہ ہزاروں اور لاکھوں جانے گئیں، اربوں کھربوں کا مالی نقصان ہوا، معزز مقامات کی بے حرمتی کی گئی اور قابل احترام آثار قدیمہ کو تہس نہس کر دیا گیا؛ اسرائیلی ریاست اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ وہ اپنے دم پر کچھ کر سکے لیکن عالمی طاقتوں نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا اور اس کو خوب پھلنے پھولنے کا موقع فراہم کیا۔ عالمی سیاست پر گہری نظر رکھنے والے، تجزیہ نگار، تبصرہ نگار اور مفکروں نے اس کا تفصیلی منظر نامہ کھینچا ہے۔

آج صورت حال یہ ہے کہ فلسطین کو خطۂ ارض سے ہی ختم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، اس کا نام ونشان مٹانے کے لیے طرح طرح کے حربے استعمال کئے جا رہے ہیں، صہیونی طاقتیں فلسطین کو اپنے منھ کا لقمہ بنا کر ہڑپ کرنا چاہتی ہیں؛ دنیا یہ منظر نامہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے اور خاموش تماشائی ہے۔۔۔لیکن مظلوموں کا خون رائیگاں نہیں جاتا ہے، ظلم وستم کبھی پنپتا نہیں ہے، ہر ایک عروج کو زوال ہے۔۔۔ایک دن وہ بھی آئے گا کہ یہ ظلم وستم تھمے گا، اس داستان کا اختتام ہوگا، حالات بدلیں گے، اہل حق کی فتح ہوگی، باطل کے منصوبے ناکام ہوں گے، دجالی طاقتیں زیر ہوں گے، فلسطین کی سرزمینیں آزاد

ہوں گی اور اہل فلسطین آزادی اور راحت کی سانس لیں گے۔۔۔بس کچھ عرصے کے لیے اندھیروں کا راج ہے،عنقریب اجالا ہونے کو ہے،فتنوں کی شام ہے اور سحر ہونے کو ہے۔۔۔ان شاء اللہ

طول غم حیات سے گھبرا نہ اے جگر
ایسی بھی کوئی شام ہے جس کی سحر نہ ہو

ایک دل چسپ سوال اور جواب

مشہور فرانسیسی فلسفی ادیب وولٹائر نے اپنی کتاب ''زیڈگ۔ تقدیر کا ایک بھید'' میں ایک دلچسپ سوال و جواب ذکر کیا ہے۔

''میگی'' نے ''زیڈگ'' سے سوال کیا: دنیا کی چیزوں میں سے وہ کون سی چیز ہے جو سب سے زیادہ طویل ہے مگر سب سے مختصر بھی، سب سے تیز رفتار بھی اور سست ترین بھی، سب سے زیادہ تقسیم ہو جانے والی بھی اور سب سے زیادہ کھنچ جانے والی بھی، سب سے زیادہ نظر انداز بھی کی جاتی ہے مگر اسی کا سب سے زیادہ افسوس بھی ہوتا ہے، ایسی چیز جس کے بغیر کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا، جو معمولی چیزوں کو ختم کر دیتی ہے، مگر غیر معمولی چیزوں کو دوام بخش دیتی ہے؟

زیڈگ نے بلاتردد جواب دیا: ''وقت''۔ اور مزید کہا: وقت سے زیادہ طویل کوئی چیز نہیں، کیوں کہ یہ ابدیت کا پیمانہ ہے؛ اس سے زیادہ مختصر کوئی شئے نہیں، کیوں کہ یہ ہمارے منصوبوں اور آرزوؤں کی تکمیل کے لیے ہمیشہ ناکافی ثابت ہوتا ہے؛ اس سے زیادہ سست رفتار کوئی چیز نہیں، اس کے لیے جو کسی امید اور انتظار میں ہو؛ اس سے زیادہ تیز رفتار کوئی چیز نہیں، اس کے لیے جو خوشی و مسرت کے لمحات میں ہو؛ طول میں یہ ابدیت تک جا پہنچتا ہے اور چھوٹا ہونے کی بات ہو تو سیکنڈ کے ہزاروں، کروڑوں اور اربوں حصوں میں تقسیم ہو سکتا ہے؛ ہر

شخص اسے نظر انداز کرتا ہے اور سب ہی اس کے ضائع ہونے پر افسوس بھی کرتے ہیں؛ وقت کے بغیر کچھ نہیں کیا جا سکتا؛ یہ ہر معمولی واقعے کو آئندہ نسل میں منتقل ہونے سے پہلے ہی طاق نسیاں کے حوالے کر دیتا ہے اور ہر ایسے عمل کو لافانی بنا دیتا ہے جو واقعی عظیم ہو۔

قرآن، سائنس اور موریس بوکائلے

موریس بوکائلے (Maurice Bucaille) کی پیدائش ۱۹۲۰ء میں ہوئی تھی، وہ ایک فرانسیسی طبیب تھے، جو جامعہ پیرس کے ہسپتال میں رئیس جراحی کے طور پر کام کرتے تھے اور فرانس کی ''میڈیکل ایسوسی ایشن'' کے مدیر تھے۔ ساتھ ہی ایک بہترین مصنف بھی تھے، کئی ساری کتابیں تصنیف کیں۔ ان کا انتقال ۱۹۹۸ء میں ''پیرس'' میں ہوا۔ ان کی سب سے زیادہ شہرت کی وجہ ان کی کتاب ''بائبل، قرآن اور سائنس'' ہے، جس میں انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن کی کوئی عبارت سائنسی نقطۂ نظر کے خلاف نہیں ہے، جب کہ بائبل میں بہت سی عبارتیں جدید سائنسی حقائق کی نفی کرتی ہیں؛ ان کی یہ فرانسیسی کتاب بہت مقبول ہوئی اور کئی زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔ اسلامی دنیا میں بھی یہ کتاب بہت مقبول ہوئی، مگر مغرب میں زیادہ تر لوگوں کے لیے یہ وجہِ بغض بن گئی اور انہوں نے اسے ''بیوکلیذم'' کا نام دیا۔

بتایا جاتا ہے کہ ''موریس بوکائلے'' ۱۹۷۳ء میں سعودی عرب کے بادشاہ ''شاہ فیصل'' کے ذاتی معالج مقرّر ہوئے۔ ۱۹۷۳ء ہی کا واقعہ ہے کہ آپ ''شاہ فیصل'' کا علاج کرنے کے لیے سعودی عرب گئے۔ شاہ فیصل کسی کام میں مشغول تھے، اس لیے ان سے تھوڑی دیر انتظار کرنے کے لیے کہا گیا؛ آپ

لکھتے ہیں کہ: ''جس کمرے میں میں ٹھہرا ہوا تھا، اس کمرے میں ایک قرآن رکھا ہوا تھا؛ چوں کہ میں خالی تھا اس لیے میں نے اس قرآن کو اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیا، جب میں اس قرآن کو پڑھ رہا تھا تو مجھے لگا کہ اس کے اندر بہت ساری آیتیں ''میڈیکل سائنس'' سے متعلق ہیں، میں نے ان ساری آیتوں کو نوٹ کرلیا؛ اور جب فرانس واپس آیا تو ان ساری آیتوں پر تحقیق کی تو ان میں ایک آیت بھی ایسی نہیں تھی جو سائنس سے ٹکراتی ہو، میں نے سوچا کہ جن چیزوں کو ''میڈیکل سائنس'' نے آج دریافت کیا ہے، اس کتاب کے اندر آج سے چودہ سو سال پہلے کس نے ان باتوں کو لکھ دیا؟۔ بس یہ وہ واقعہ تھا جو میرے اسلام لانے کا سبب بنا''۔ اس کے بعد انہوں نے بائبل کے اندر سے بھی وہ عبارتیں نکالیں جو سائنس سے متعلق تھیں اور ان پر بھی تحقیق کی، تو اس میں ایک آیت بھی سائنسی لحاظ سے درست معلوم نہیں ہوئی۔ اس کے بعد اسی کو لے کر انہوں نے ایک کتاب لکھی، جس کا انگلش نام ہے: The Bible, The Quran and Science

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو قرآن ''موریس بوکائلے'' کی زندگی کو بدل سکتا ہے، ان کو سیدھا اور سچّا راستہ دکھا سکتا ہے اور ان کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کرسکتا ہے؛ کیا وہ قرآن ایک مسلمان کی زندگی کو نہیں بدل سکتا؟ اس کو سیدھا راستہ نہیں دکھا سکتا؟ ہم میں اور ''موریس بوکائلے'' میں فرق یہ ہے کہ ہم قرآن کریم کو پہلی بات تو پڑھتے ہی نہیں اور اگر پڑھتے بھی ہیں تو سمجھے بغیر صرف تلاوت اور ثواب کی نیت سے پڑھتے ہیں، اس لیے ہمیں قرآن سے کچھ حاصل نہیں ہو پاتا اور قرآن پڑھنے کے بعد بھی ہماری زندگی میں کوئی بدلاؤ نظر نہیں

آتا؛ جب کہ انہوں نے اس قرآن کو پڑھا تو سمجھ کر پڑھا اور اس کی ایک ایک آیت پر خوب غور کیا، جس کے نتیجے میں ان کے سامنے ہدایت کے راستے واضح ہو گئے۔

اگر ہم بھی قرآن سے ہدایت حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اپنی دنیوی و اخروی زندگی سنوارنا چاہتے ہیں تو قرآن کریم کو سمجھ کر پڑھیں، ان شاء اللہ ہمارے لیے بھی ہدایت کے سامان مہیا ہوں گے؛ یہ کتاب ان لوگوں کے لیے ہدایت ہے جو غور وفکر اور تدبر کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ دنیا کی تقریباً سبھی زبانوں میں قرآن کریم کے ترجمے اور تفسیریں لکھی جا چکی ہیں اور بڑے پیمانے پر ان کی نشر واشاعت بھی ہو رہی ہے؛ اس لیے نابلد ہونے کا سوال اب بے معنی ہے۔ اگر ہم قرآن کریم کو اس کے معنی اور مفہوم کے ساتھ غور وفکر اور تدبر کی نظر سے پڑھیں گے تو ہمارے سامنے بھی علوم ومعارف کے ذخیرے کھلیں گے، جن کی روشنی میں ہم ان شاء اللہ راہ یاب ہو جائیں گے۔

قربانی کی حقیقت اور فضیلت

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
عشق ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

قربانی ایک چھ بے جان حروف کا مجموعہ ہے، مگر اس مجموعے پر جب غور کیا جاتا ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں کتنی مشقتوں سے گزرنا پڑتا ہے؛ یہ بظاہر بہت دشوار گزار گھاٹی ہے، مگر حیاتِ جاودانی کا پیغام اپنے اندر رکھتی ہے۔ یہ عبادات مالیہ میں سے ایک عظیم عبادت ہے، جو صاحب استطاعت افراد پر ہر سال مخصوص ایام اور اوقات میں واجب ہے۔ یہ درحقیقت رب کریم کے پیارے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس عظیم قربانی کی یادگار ہے جب آپ نے عالم خواب میں قربانی کا حکم پا کر اپنی جان سے عزیز لخت جگر حضرت اسماعیل علیہ السلام کے پھول کی پتی سے نازک اور ریشم سے زیادہ نرم گلے پر اپنے رب کے حکم کی تعمیل میں چھری رکھ دی تھی اور اس قربانی کے سبب رضائے الٰہی کے ساتھ ملائکہ کو بھی ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا اور یہ واضح کر دیا تھا کہ ابراہیم کا دل اپنے رب کے سوا کسی کا مسکن نہیں، وہ محبتِ الٰہی سے معمور ہے، کسی اور کی محبت اس پر غالب نہیں، اس کے تمام تر جذبات محبت خداوندی کے تابع

ہیں۔

ہوا یہ تھا کہ جب ابراہیم علیہ السلام ملک ''شام'' جا پہنچے، تو آپ نے بارگاہ ایزدی میں دعا کی کہ اے میرے رب! مجھے ایک نیک صالح لڑکا عطا فرما۔ بارگاہ رب العالمین میں یہ دعا قبول ہوئی اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک حلیم المزاج لڑکا حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شکل میں عطا فرمایا۔ پھر جب ابراہیم علیہ السلام نے ''مکہ مکرمہ'' کو اپنا مسکن بنایا اور اسماعیل علیہ السلام بھی چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے، تو ایک دن آپ نے خواب میں دیکھا کہ میں اپنے اس لخت جگر کو اللہ کے حکم سے ذبح کر رہا ہوں؛ انبیاء علیہم السلام کا خواب چوں کہ وحی ہوتا ہے، اس لیے آپ اس حکم کی تعمیل پر آمادہ ہو گئے اور اپنے لخت جگر سے اس خواب کا تذکرہ کیا؛ بیٹے نے کہا: ابا جان! آپ کو جو حکم ہوا ہے آپ اسے پورا کیجیے، ان شاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔ الغرض جب دونوں نے خدا کے حکم کو تسلیم کر لیا اور باپ نے بیٹے کو ذبح کرنے کے لیے کروٹ پر لٹا دیا اور چاہتے تھے کہ ذبح کر ڈالیں، فوراً حکم خداوندی نازل ہوا کہ اے ابراہیم! تم نے اپنے خواب کو سچ کر دکھایا، اب اس لخت جگر کو چھوڑ دو۔ رب کریم کو یہ ادا بہت پسند آئی اور اپنے پیارے خلیل کی اس عظیم قربانی کو اپنی بارگاہ عالیہ میں شرف قبولیت عطا فرما کر جبرئیل امین کو جنت سے ''دنبہ'' لے جانے کا حکم دیا اور اسے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی جگہ پر ذبح کرایا، پھر رب کریم نے اس سنت ابراہیمی کو ہمیشہ کے لیے باقی رکھا۔

ہر دور میں قربانی کا یہ سلسلہ چلتا رہا، حتی کہ زمانۂ جاہلیت میں بھی قربانی کا رواج رہا، مگر ان کا طریقۂ کار یہ تھا کہ جانوروں کو بتوں کے نام پر ذبح کرتے

تھےاور ذبح کرنے کے بعد خون ''کعبہ معظّمہ'' کی دیواروں پر لگا دیتے تھے اور گوشت بتوں کے سامنے اکٹھا کر دیتے تھے؛ بعدازآں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاتم المرسلین کا تاج سجائے ہوئے مبعوث ہوئے، تو رب کریم نے قربانی کا حکم باقی رکھتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''**فصل لربک وانحر**'' کہ آپ اپنے رب کے نام سے ذبح کیجیے۔ حافظ ابن کثیر اور امام رازی رحمہا اللہ نے حضرت عبداللہ ابن عباس، حضرت عطاء، حضرت مجاہد، حضرت عکرمہ، حضرت حسن بصری، حضرت قتادہ، حضرت محمد بن کعب قرظی اور حضرت ضحاک رحمہم اللہ وغیرہ کا قول نقل کیا ہے کہ مشرکین عرب غیر اللہ کے نام پر جانور ذبح کرتے تھے، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ آپ اپنے رب کے نام پر جانور ذبح کریں۔ (تفسیر ابن کثیر: ص ۴۲۷، ج ۴)

ساتھ ہی زمانۂ جاہلیت کی مذکورہ رسم کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **لن ینال اللہ لحومھا ولا دمائھا ولکن ینالہ التقویٰ منکم** (سورہ حج آیت ۳۷) کہ نہیں پہنچتا ہے اللہ کو جانوروں کا گوشت اور ان کا خون، البتہ پہنچتا ہے اس کے حضور میں تمہارا تقوی۔ یعنی رب کریم کو ان جانوروں کے گوشت اور خون کی قطعاً ضرورت نہیں ہے، وہ تو صرف یہ دیکھتا ہے کہ تمہارے دلوں میں کس قدر خوف الٰہی اور تقویٰ موجود ہے؟ اطاعت وفرماں برداری کے کتنے جذبات موجزن ہیں؟۔ قربانی کی اصل روح اور حقیقت یہی ہے کہ مسلمان اللہ تعالیٰ کی محبت میں اپنی تمام تر نفسانی خواہشات کو قربان کردے، جانور ذبح کرکے قربانی دینے کے حکم میں یہی حکمت پوشیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں تمام خواہشات نفسانیہ کو ایک ایک کرکے ذبح کردیا جائے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حیاتِ طیبہ میں مسلسل قربانی فرماتے رہے اور صحابہ کرام کو بھی اس کی عظمت واہمیت سے آگاہ فرماتے رہے۔ایک حدیث میں ہے: **عن زید بن ارقم رضی اللہ عنه قال: قال أصحاب رسول اللہ: یا رسول اللہ! ما هذه الأضاحی؟ قال: سنة أبیکم إبراهیم علیه السلام، قالوا: فما لنا فیها یا رسول اللہ؟ قال: بکل شعرة حسنة، قالوا: فالصوف؟ یا رسول اللہ! قال: بکل شعرة من الصوف حسنة** (ابن ماجه ۳۱۱۸) حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرات صحابہ نے عرض کیا کہ: یارسول اللہ! یہ قربانیاں کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا: تمہارے باپ حضرت ابراہیم کی سنت ہے۔صحابہ نے عرض کیا کہ: اس میں ہم کو کیا ملے گا؟ فرمایا کہ: ہر بال کے بدلے میں ایک نیکی۔عرض کیا کہ اون کے بدلہ میں کیا ملے گا؟ فرمایا کہ ہر بال کے بدلے میں ایک نیکی ملے گی۔

ایک دوسری روایت میں ہے: **عن عائشة رضی اللہ عنها قالت: قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم ما عمل ابن آدم من عمل یوم النحر احب الی اللہ من اهراق الدم وانه اتی یوم القیامة بقرونها واشعارها وظلافها وان الدم لیقع من اللہ بمکان قبل ان یقع بالارض فطیبوا بها نفسا** (ترمذی ۱۴۱۳) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایام قربانی میں انسان کا کوئی عمل اللہ کو قربانی سے زیادہ محبوب نہیں ہے، اور وہ آدمی قیامت کے دن اس جانور کی سینگوں، بالوں اور کھروں کے ساتھ آئے گا اور قربانی کا خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہو جاتا ہے؛ پس اللہ کے بندوں! خوش دلی کے ساتھ

قربانی کیا کرو۔

حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص اس طرح قربانی کرے کہ اُس کا دل خوش ہو اور وہ اپنی قربانی میں ثواب کی نیت رکھتا ہو، تو وہ قربانی اس شخص کے لیے دوزخ سے آڑ ہو جائے گی۔ (المعجم الکبیر للطبرانی)

احادیث میں قربانی نہ کرنے والوں کے لیے بھی سخت وعید وارد ہوئی ہے، ایک حدیث میں ہے: **عن ابی هریرة رضی الله تعالیٰ عنه ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال: من وجد سعة فلم یضح فلا یقربن مصلانا** (ابن ماجه ۳۱۱۴، الترغیب والترهیب ۲/۱۰۳) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کے پاس قربانی کی وسعت ہو (صاحب نصاب ہو) اور پھر وہ قربانی نہ کرے، تو وہ ہماری عید گاہ کے قریب بھی نہ آئے۔

دیکھیے! پیغمبر علیہ السلام نے کس قدر ناراضگی کا اظہار فرمایا ہے۔ عید گاہ میں نہ آنا تو دور کی بات، عید گاہ کے قریب بھی نہ آنے کی بات کہی جا رہی ہے۔ اور یہ ان لوگوں کے لیے ہے جو قربانی کی استطاعت رکھتے ہوں اور پھر بھی قربانی نہ کریں۔

شوق کتب اور ذوق مطالعہ

مطالعہ کا ذوق وشوق ہر زمانے میں رہا ہے، ہر دور میں ایسے لوگ پائے جاتے رہے ہیں جنہوں نے کتابوں کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا؛ سر دست دو تین واقعے پیش ہیں۔

مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اپنے گھرانے اور خود اپنے ذوق کے بارے میں فرماتے ہیں کہ: ہمارا گھرانہ علماء و مصنفین کا گھرانہ ہے، والد صاحب اپنے زمانے کے عظیم مصنفوں میں تھے، خاندانی وموروثی اثرات بڑے طاقتور ہوتے ہیں، وہ نسل درنسل منتقل ہوتے رہتے ہیں اور بچوں اور بچیوں سب میں ان کے اثرات کم وبیش پائے جاتے ہیں؛ کچھ یہ آبائی اثر، کچھ والد صاحب کا ذوق وانہماک، ہمارے سارے گھر پر کتابی ذوق سایہ فگن تھا؛ کتب بینی کا یہ ذوق، ذوق سے بڑھ کر لت اور بیماری کی حد تک پہونچ گیا تھا، کہ کوئی چھپی ہوئی چیز سامنے آجائے تو اس کو پڑھے بغیر چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ ہم بھائی اور بہنوں کو تھوڑے پیسے دست خرچ کے لیے ملتے یا خاندان کے کوئی بزرگ جاتے ہوئے (اس زمانے کے خاندانی رواج کے مطابق) بچوں کو روپیہ دے جاتے، اس کا ایک ہی محبوب مصرف تھا کہ اس سے کوئی کتاب خریدی جائے۔ اس سلسلے میں خود میری ایک دل چسپ کہانی سنتے چلیے! کہ میرے پاس

اس طرح کچھ پیسے آ گئے، وہ ایک دو آنے سے زیادہ نہ تھے، میں اتنا چھوٹا تھا کہ مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کتاب کتب فروشوں ہی کے یہاں ملتی ہے، اور ہر چیز کی دکان الگ ہوتی ہے؛ میں ''امین آباد'' گیا، گھنٹہ گھر والے پارک کے سامنے بڑی دکانوں کی جو قطار ہے، اس میں کسی دوا فروش کی دکان پر پہونچا، غالبا ''سالومن'' کمپنی تھی، میں نے پیسے بڑھائے کہ کتاب دیجیے، دکان پر کام کرنے والے نے سمجھا کہ کسی شریف گھرانے کا بھولا بھالا بچہ ہے، ''کیمسٹ'' کی دکان پر کتاب کیا ملتی، دواؤں کی فہرست اردو میں تھی، انہوں نے وہی بڑھا دیا، اور پیسے بھی واپس کر دیے؛ میں پھولے نہ سماتا تھا کہ کتاب بھی مل گئی اور پیسے بھی واپس ہو گئے۔ خوش خوش گھر پہونچا اور اس سے اپنے چھوٹے سے اس ''کتب خانہ'' کو سجایا جو والد صاحب کے یہاں کی ان کتابوں سے بنایا تھا، جو ان کے لیے بے کار تھیں اور وہ ردی میں ڈال دیتے تھے۔ یہی شوق میری دونوں بہنوں کا تھا کہ کتاب کے بغیر ان کو چین ہی نہیں آتا تھا۔ (کاروانِ زندگی: ۱/ ۵۸)

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

اس ناکارہ کا معمول ۱۳۳۵ھ سے ایک وقت کھانے کا ہو گیا تھا، کہ رات کو کھانے میں مطالعہ کا حرج ہوتا، نیند بھی جلد آتی تھی، پانی بھی زیادہ پیا جاتا تھا؛ ابتداء میری ایک چھوٹی بہن کھانا لے کر اوپر میری کوٹھری میں پہنچ جاتی تھی اور لقمہ بنا کر میرے منھ میں دیتی تھی اور دیکھتی رہتی تھی کہ جب منھ بند ہو جاتا تو دوسرا لقمہ دے دیا کرتی تھی، اس ناکارہ کو التفات بھی نہیں ہوتا تھا کہ کیا کھلایا؟۔ ایک دو سال بعد اس کو بھی بند کر دیا، اس زمانے میں بھوک تو خوب لگتی مگر حرج کا اثر بھوک پر غالب تھا۔ (متاعِ وقت اور کاروانِ علم: ۲۸۴)

مفتی محمد شفیع عثمانی نور اللہ مرقدہ کے بارے میں مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ لکھتے ہیں: جب والد صاحب کا رشتۂ تلمذ شاہ صاحب کشمیریؒ کے ساتھ قائم ہوا تو جو علمی مذاق گھٹی میں پڑا تھا اسے اور جلا ملی اور وسعتِ مطالعہ، تحقیق و تدقیق اور کتب بینی کا صرف ذوق ہی نہیں بلکہ اس کی نہ مٹنے والی پیاس پیدا ہوگئی۔ حضرت والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ دوپہر کو جب مدرسے میں کھانے اور آرام کا وقفہ ہوتا تو میں اکثر ''دارالعلوم دیوبند'' کے کتب خانے میں چلا جاتا تھا، وہ وقت ناظم کتب خانہ کے بھی آرام کا ہوتا تھا، اس لیے ان کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ میری وجہ سے چھٹی کے بعد بھی کتب خانے میں بیٹھے رہیں؛ چناں چہ میں نے انہیں باصرار اس بات پر آمادہ کرلیا تھا کہ دوپہر کے وقفے میں جب وہ گھر جانے لگیں تو مجھے کتب خانے کے اندر چھوڑ کر باہر سے تالا لگا جائیں، چناں چہ وہ ایسا ہی کرتے اور میں ساری دوپہر علم کے اس رنگارنگ باغ کی سیر کرتا رہتا تھا۔ (میرے والد میرے شیخ: ۱۲)

عشق رسول کیا ہے؟

کہا جاتا ہے کہ ایک کیڑے نے دعوی کیا کہ میں پروانہ ہوں، اس سے کہا گیا کہ فلاں جگہ شمع جل رہی ہے وہاں سے ہو کر آؤ، اس کے بعد ہم تمھیں پروانہ تسلیم کریں گے؛ وہ اڑتا ہوا گیا اور تھوڑی دیر میں واپس آ گیا اور دل میں یہ خیال لیے ہوئے آیا کہ اب میں اصلی پروانہ کہلانے کا مستحق ہوں، جب وہ صحیح سالم واپس پہنچ گیا، تو کہا گیا کہ تم اصلی پروانہ نہیں، نقلی ہو؛ وہ کہنے لگا: واہ! ہم نے تو شرط بھی پوری کر دی، اب کیا رہ گیا ہے؟ اس سے کہا گیا کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ شمع جل رہی ہو اور پروانہ زندہ واپس آ جائے، کیوں کہ اصلی پروانہ تو شمع پر قربان ہو جاتا ہے، واپس نہیں آتا۔

آج ہمارا حال بھی یہی ہے کہ ہم عاشق رسول ہونے کا دعوی تو بہت کرتے ہیں، مگر عشق رسول والے اعمال نہیں اپناتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام آیا تو انگوٹھے چوم کر آنکھوں پر رکھ لیے، محض سیرت النبی کا جلسہ کر لیا، جھنڈے اٹھا لیے اور یا رسول اللہ یا محمد کا نعرہ لگا لیا اور سمجھ لیا کہ ہم پکے عاشق رسول ہو گئے۔ یاد رکھیں: اس کا نام عشق رسول نہیں ہے، بلکہ عشق رسول نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنے کا نام ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر چلنے اور آپ کے کردار کو اپنانے کا نام ہے۔ عشق رسول کی دلیل سنت پر عمل ہے، آپ

صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **من احب سنتي فقد احبني و من احبني كان معي في الجنة** (جامع ترمذی) جو میری سنت سے محبت کرنے والا ہے، وہی مجھ سے محبت کرنے والا ہے اور جو مجھ سے محبت کرنے والا ہے، وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔ معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام کی سنتوں پر عمل کرنے کا نام عشق رسول ہے۔

سچے عاشق رسول وہ تھے کہ جنہوں نے اپنی جانیں تو دے دیں مگر مذہب اسلام، احکامات قرآن اور فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر ذرہ برابر بھی آنچ نہیں آنے دی۔ ایک سچا عاشق رسول یہ کیسے برداشت کرسکتا ہے کہ انسان دوزخ کے راستے پر چل رہا ہوں اور اسے چین آ جائے اور اپنی قوم وملت کا غم اسے نہ ستائے۔ سید التابعین حضرت سعید ابن مسیب رضی اللہ عنہ کو دیکھیے! حکام کے حکم سے ان کی پیٹھ پر درے لگائے جارہے ہیں، مگر ان کی زبان سے صدائے حق مسلسل بلند ہورہی ہے۔ امام ابوحنیفہ نور اللہ مرقدہٗ بغداد کے قید خانے میں اسیر ہیں، لیکن اس کے باوجود زبان صدق اعلان حق میں پہلے سے بھی زیادہ سرگرم ہے۔ اس طرح کے سینکڑوں واقعات تاریخ کے صفحات پر بکھرے پڑے ہیں۔

آج ہمارے ذہنوں میں بس یہ رچ بس گیا ہے کہ عشق رسول یہ ہے کہ ربیع الاول کا مہینہ آئے تو خوشیاں منالی جائیں، بازاروں میں جھنڈیاں لگالی جائیں، لوبانوں کی بتیاں سلگالی جائیں، جلوس نکال لیا جائے وغیرہ۔ یاد رکھیں: اگر ان چیزوں کا نام عشق رسول ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم جنہوں نے امت کے لیے ہر مسئلہ کی رہنمائی فرمادی، کہیں ان چیزوں کا بھی تو ذکر فرماتے۔ لہذا

ضروری ہے کہ ہم اپنا وقت بدعات وخرافات میں ضائع نہ کر کے صحیح راستے پر چلیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور آپ کی تمام سنتوں کو بجا لائیں، تب کہیں ہمارا نام عاشقان رسول کی فہرست میں شمار ہوگا، ورنہ عشق رسول لوبانوں کی بتیوں میں سلگ کر رہ جائے گا اور ہمیں خبر تک نہیں ہوگی۔ اللہ تعالی ہمیں صحیح سمجھ عطا فرمائے، دین اسلام پر استقامت نصیب فرمائے اور صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

کلکی اوتار اور محمد صاحب

ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق ہندو دنیا ''کلکی اوتار'' کی منتظر ہے، جوان کا اور پوری دنیا کا رہبر ہوگا؛ اس ''اوتار'' کی تعریف اور شناخت جو ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں بیان کی گئی ہے اور ''ویدوں'' اور ''اپنشدوں'' میں جو علامتیں، نشانیاں، اور وضاحتیں بیان کی گئی ہیں، وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتی ہیں۔ ایک ہندو ''پنڈت'' نے اس کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے اور ''کلکی اوتار اور حضرت محمدؐ'' کے نام سے کتاب لکھی ہے۔ یہ ''بھارت'' میں شائع ہونے والی منفرد کتاب ہے، اس کتاب میں مصنف نے ہندوؤں کی مذہبی کتابوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ اپنے عقیدے کے مطابق جس آخری اوتار کی آمد کے منتظر ہیں اور ان کے عقیدے کے مطابق وہ ان کا اور پوری دنیا کا رہنما ہے، وہ اوتار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں ظاہر ہو چکا ہے۔ یہ کتاب ایک ہندو عالم و فاضل پنڈت ڈاکٹر ''وید پرکاش اپادھیائے'' نے لکھی ہے، جو علم و دانش میں اپنی شہرت رکھتے ہیں۔ یہ کتاب انہوں نے برسوں کی تحقیقات کے بعد لکھی ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ آٹھ دس دیگر فاضل پنڈتوں نے بھی اس کتاب سے اور اس میں پیش کردہ دلائل سے کلی طور پر اتفاق کیا ہے اور مصنف کی طرف سے پیش کیے جانے والے تمام نکات کو درست قرار دیا ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ تمام

ہندوؤں پر یہ لازم آتا ہے کہ وہ اپنے موعودہ اوتار کا انتظار چھوڑ کر حضرت محمد کو آخری اوتار تسلیم کرلیں، بلکہ مصنف نے ان ہندوؤں کو احمق اور عقل سے عاری قرار دیا ہے جو آج کے دور میں کسی نئے شہسوار اور ماہر شمسیر زن کی شکل میں موعودہ اوتار کے منتظر ہیں۔

مصنف نے بہت عرصہ غور وفکر کے بعد اس کتاب کو تصنیف کیا ہے، گویا یہ دعوت حق کی داستان ہے؛ انہوں نے ہندوؤں کی مذہبی کتابوں اور ''ویدوں'' میں غوطہ لگایا تو ان پر منکشف ہوا کہ دین حق درحقیقت ایک ہی ہے، خدا ایک ہی ہے، خدا کے رسول ایک ہی پیغام توحید لے کر دنیا میں آئے، اور ویدوں میں جس آخری پیشوا، پیغمبر اور اوتار کا ذکر ہے، وہ درحقیقت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ انہوں نے ویدوں میں مذکور ''کلکی اوتار'' کی خصوصیات کو سامنے رکھا اور دوسری طرف سیرت طیبہ پر نگاہ ڈالی، ان کے سامنے حقیقت واضح ہوئی، جس کا انہوں نے کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔

کتاب کی تمہید میں مصنف لکھتے ہیں کہ: اسلامی روایات میں جو مقام رسولوں، نبیوں یا پیغمبروں کا ہے وہی مقام ہندوستانی روایات میں ''اوتاروں'' کا ہے۔ مسلمان حضرت ''محمد'' کو آخری نبی مانتے ہیں اور ہندوستان میں ''کلکی'' کو آخری اوتار کہا گیا ہے۔ دیگر ممالک میں صرف پیغمبر آئے اور ہندوستانی روایات میں صرف اوتار، یہ کیسے ممکن ہے؟ جب کہ ساری زمین اللہ کی ہے۔۔۔ حضرت محمد آخری نبی ہیں، اس حقیقت کو جان کر مجھے شوق پیدا ہوا کہ ''کلکی اوتار'' کے متعلق سیرت کا مطالعہ ''پرانوں'' میں کیا جائے؛ ہندوستانی روایات کے مطابق پہلے کچھ دور گزر چکے ہیں، موجودہ دور میں جو واقعات رونما ہوں گے ان کی

مطابقت میں نے حضرت محمد کی حیات طیبہ سے کی، تو تقریبا یکساں پایا؛ میں نے صرف اس مقصد سے اس تحقیقی کام کو ہاتھ میں لیا ہے کہ اللہ کے حکم سے ''کلام اللہ'' کی تبلیغ ہو۔۔۔نام سے کوئی شخص ہندو، عیسائی یا مسلمان نہیں ہوسکتا، مثلا اگر سراج الحق کو ستیہ دیپ، عبداللہ کو پنڈت رام داس یا رام لیش، اور عبدالرحمن کو بھگوان داس کہوں گا تو بے جانہ ہوگا، کیوں کہ ان ناموں کا ''سنسکرت'' مفہوم یہی ہوتا ہے؛ میرے نام کا عربی ترجمہ ''نورالہدیٰ'' ہے، اگر وہ چاہیں تو مجھے نور الہدیٰ بھی کہہ سکتے ہیں؛ اللہ تعالی سے دعا ہے کہ میری تحقیقی کتاب لوگوں میں نیک خیالات پیدا کرے، اور بنی نوع انسان کامیاب ہو۔

مصنف نے اس کتاب میں ''اوتار'' کے معنی، اوتار کے اسباب نزول، آخری اوتار کی بعثت کے اسباب اور آخری اوتار کی خصوصیات کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور دلائل وشواہد سے یہ ثابت کیا ہے کہ آخری اوتار (پیغمبر) محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ ویدوں اور قرآنی تعلیمات میں مطابقت کو بھی بیان کیا ہے اور آخر میں تتمہ کے طور پر خلاصہ پیش کیا ہے، جس میں دین حق کا اعتراف، خدا وحدہ کا اقرار اور آخری پیغمبر کو تسلیم کیا ہے اور تمام لوگوں سے دین حق کی طرف لوٹ جانے کی اپیل کی ہے۔ اور بڑے عاجزانہ انداز میں کہا ہے کہ: لاٹھیوں کی ضربوں سے مذہب نہیں پھیلتا، بلکہ جب اللہ کے فضل سے لوگوں کو دین حق کا علم ہوجاتا ہے تو خود ہی اس پر عمل کرنے لگتے ہیں، علمائے دین کا فرض ہے کہ وہ دین کے اصولوں سے لوگوں کو واقف کرائیں، عقیدت پیدا ہونے پر عمل کریں گے، فساد کرنے سے کوئی کیوں مانے گا، اللہ کے دین کے مبلغین کو امن واطمینان کے ساتھ دین کی تبلیغ کرنی چاہیے۔

جناب ''وید پرکاش اپادھیائے'' صاحب کی یہ تحقیق قابل قدر ہے، یہ ایک نایاب کتاب ہے، اس کتاب کا ہر ایک کو مطالعہ کرنا چاہیے اور بڑے پیمانے پر اس کی نشر واشاعت کرنی چاہیے، مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ کر کے لوگوں تک پہنچایا جائے، اور سنجیدگی کے ساتھ اس موضوع پر غور وفکر کیا جائے۔

فتاوی دارالعلوم وقف دیوبند کی اشاعت

بہت مدت سے انتظار تھا کہ ''دارالعلوم وقف دیوبند'' کے فتاوی چھپ کر منظر عام پر آئیں، تاکہ ان سے استفادہ عام ہو؛ الحمدللہ اب یہ انتظار ختم ہوا اور دارالعلوم وقف دیوبند کے فتاوی کتابی شکل میں تیار ہوکر منظر عام پر آنا شروع ہوگئے ہیں۔ کئی جلدیں شائع ہوچکی ہیں اور پندرہ جلدوں میں لانے کا منصوبہ ہے، لیکن اٹھارہ سے بیس جلدوں میں تکمیل ہوسکتی ہے۔ روزمرہ کے پیش آمدہ مسائل پر مشتمل یہ ایک قیمتی ذخیرہ ہے اور فقہ وفتاوی کے باب میں ایک عمدہ اضافہ ہے۔ شروع میں ایک تفصیلی علمی مقدمہ ہے، جو محبوب علمی شخصیت حضرت مولانا محمد سفیان قاسمی دامت برکاتہم مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند کے قلم سے لکھا گیا ہے؛ یہ مقدمہ بہت سارے پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے اور مستقل کتابچہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ فتاوی کی خوبی یہ ہے کہ تکرار سے مکمل اجتناب کیا گیا ہے، عنوانات لگائے گئے ہیں، مسئلہ نمبر لکھا گیا ہے اور حاشیے میں ہر مسئلہ کا قرآن و حدیث اور معتبر فقہی کتابوں سے حوالہ دیا گیا ہے؛ حوالہ دیتے وقت نئے اسلوب کو ترجیح دی گئی ہے، یعنی پہلے مصنف کا نام، پھر کتاب کا نام اور پھر باب اور فصل وغیرہ۔ ترتیب انتہائی آسان اور جامع ہے، ہر شخص بآسانی استفادہ کرسکتا ہے، باب قائم کرکے اس کو چند فصلوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ اس موقع پر ''لجنہ ترتیب الفتاوی'' اور ''حجۃ الاسلام اکیڈمی'' مبارک بادی کے مستحق ہیں۔ اللہ رب العالمین اس مجموعے کو امت کی رہنمائی کا ذریعہ بنائے، جن مفتیان کرام نے یہ فتاویٰ لکھے ہیں اور جن کی محنتوں اور کوششوں سے کتابی شکل میں منظر عام پر آرہے ہیں ان سب کو خوب بہتر بدلہ عطا فرمائے۔

ایک شعر کے متعلق وضاحت

ہم نے متعدد مرتبہ یہ مشہور و معروف شعر اپنی زندگی کے مختلف پہروں میں سن اور پڑھ رکھا ہے اور محفلوں اور مجلسوں میں یہ شعر خوب گنگنایا جاتا ہے کہ:

عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

ہم میں سے اکثریت اسے ''بہادر شاہ ظفر'' کی طرف منسوب کرتی ہے اور ہم اسے بہادر شاہ ظفر کا شعر کہتے ہیں۔ لیکن جن حضرات نے ''سیماب اکبر آبادی'' کو پڑھا ہے، انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ شعر ''سیماب'' کا ہے۔ تحقیق کرنے پر یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ یہ شعر قدرے تبدیلی کے ساتھ دونوں کا ہے۔ بہادر شاہ ظفر اور سیماب دونوں کے مطبوعہ کلام میں یہ شعر موجود ہے۔ سیماب کا اصل نام سید ''عاشق حسین'' ہے۔ سیماب اکبر آبادی نے علی گڑھ کے ایک مشاعرے میں ایک غزل پڑھی تھی، جس میں یہ شعر بھی پڑھا تھا، لیکن تھوڑی تبدیلی کے ساتھ؛ وہ کچھ یوں تھا کہ:

عمرِ دراز مانگ کے لائی تھی چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

اس میں ''لائے'' کے بجائے ''لائی'' کہا گیا ہے، اور یہ غزل ان کی

۱۹۴۷ء میں شائع ہونے والی کتاب ''کلیم عجم'' میں موجود ہے۔

سیماب اکبرآبادی کی مکمل غزل اس طرح ہے:

شاید جگہ نصیب ہو اُس گُل کے ہار میں — میں پُھول بن کے آؤں گا اب کی بہار میں

خَلوت خیالِ یار سے ہے انتظار میں — آئیں فرشتے لے کے اِجازت مزار میں

ہم کو تو جاگنا ہے ترے انتظار میں — آئی ہو جس کو نیند وہ سوئے مزار میں

اے درد! دل کو چھیڑ کے پھر بار بار چھیڑ — ہے چھیڑ کا مزہ خَلِشِ بار بار میں

ڈرتا ہوں یہ تڑپ کے لحد کو اُلٹ نہ دے — ہاتھوں سے دِل دبائے ہوئے ہوں مزار میں

تم نے تو ہاتھ جور وستم سے اُٹھالیا — اب کیا مزہ رہا سِتَمِ روزگار میں

اے پردہ دار! اب تو نکل آ، کہ حشر ہے — دنیا کھڑی ہوئی ہے ترے انتظار میں

عمرِ دراز، مانگ کے لائی تھی چار دن — دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

سیماب پھول اُگیں لحدِ عندلیب سے — اتنی تو تازگی ہو ہوائے بہار میں

(سیماب اکبرآبادی، کلیم عجم صفحہ نمبر ۲۷۳)

بہادر شاہ ظفر کے کلام میں بھی مذکورہ شعر موجود ہے، بہادر شاہ ظفر کا کلام مندرجہ ذیل ہے:

لگتا نہیں ہے جی مرا اُجڑے دیار میں — کس کی بنی ہے عالمِ ناپائدار میں

بُلبُل کو باغباں سے نہ صَیّاد سے گلہ — قسمت میں قید لکّھی تھی فصلِ بہار میں

کہہ دو اِن حسرتوں سے کہیں اور جا بسیں — اتنی جگہ کہاں ہے دلِ داغدار میں

ایک شاخ گل پہ بیٹھ کے بلبل ہے شادمان　　کانٹے بچھا دیے ہیں دل لالہ زار میں
عُمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن　　دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں
دِن زندگی کے ختم ہوئے شام ہو گئی　　پھیلا کے پاؤں سوئیں گے کُنجِ مزار میں
کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لیے　　دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

(دیوان ظفر، صفحہ نمبر ۱۶۸)

وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔۔۔

امام ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ نے ''کتاب العبر'' ایک نہایت ہی سبق آموز واقعہ بیان کیا ہے کہ: اصفہان کا ایک بہت بڑا رئیس اپنی بیگم کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھا ہوا تھا، دسترخوان خدا کی نعمتوں سے بھرا ہوا تھا، اتنے میں ایک فقیر نے یہ صدا لگائی کہ اللہ کے نام پر کچھ کھانے کے لیے دے دو، اس شخص نے اپنی بیوی کو حکم دیا کہ سارا دسترخوان اس فقیر کی جھولی میں ڈال دو، عورت نے حکم کی تعمیل کی، جس وقت عورت نے اس فقیر کا چہرہ دیکھا تو دہاڑیں مار کر رونے لگی، اس کے شوہر نے اس سے پوچھا: جی بیگم! آپ کو کیا ہوا ہے؟

اس نے بتایا کہ جو شخص فقیر بن کر ہمارے گھر پر دستک دے رہا تھا وہ چند سال پہلے اس شہر کا سب سے بڑا مال دار اور ہماری اس کوٹھی کا مالک اور میرا سابق شوہر تھا۔ چند سال پہلے کی بات ہے کہ ہم دونوں دسترخوان پر ایسے ہی بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے، جیسا کہ آج کھا رہے ہیں اتنے میں ایک فقیر نے صدا لگائی کہ میں دو دن سے بھوکا ہوں، اللہ کے نام پر کھانا دے دو، یہ شخص دسترخوان سے اٹھا اور اس فقیر کی اس قدر پٹائی کی کہ اسے لہولہان کر دیا، نہ جانے اس فقیر نے کیا بد دعا دی کہ اس کے حالات دگرگوں ہو گئے، کاروبار ٹھپ ہو گیا اور وہ شخص فقیر و قلاش ہو گیا، اس نے مجھے بھی طلاق دے دی اور اس کے چند سال

گذرنے کے بعد میں آپ کی زوجیت میں آ گئی۔

شوہر بیوی کی یہ باتیں سن کر کہنے لگا: بیگم! کیا میں آپ کو اس سے زیادہ تعجب خیز بات نہ بتاؤں؟ اس نے کہا: ضرور بتائیں؟ کہنے لگا: جس فقیر کی آپ کے سابق شوہر نے پٹائی کی تھی، وہ کوئی دوسرا نہیں، بلکہ میں ہی تھا۔

گردش زمانہ کا ایک عجیب نظارہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس بدمست مال دار کی ہر چیز، مال، کوٹھی حتی کہ بیوی بھی اس شخص کو دے دی، جو فقیر بن کر اس کے گھر پر آیا تھا اور چند سال بعد اللہ تعالیٰ اس شخص کو فقیر بنا کر اسی کے در پہ لے آیا۔ واللہ علی کل شیئ قدیر۔ تاریخ ایسے عبرت اور سبق آموز واقعات سے بھری پڑی ہے، شرط یہ ہے کہ انسان اس سے عبرت ونصیحت حاصل کرے؛ زندگی کہیں سے بھی شروع ہوسکتی ہے اور کہیں پر بھی ختم ہوسکتی ہے، لہذا مایوس ہونے کی بھی ضرورت نہیں ہے اور تکبر کی بھی قطعا ضرورت نہیں ہے؛ وقت بدلتا رہتا ہے، حالات بدلتے رہتے ہیں، تغیر زمانہ ایک ناگزیر حقیقت ہے، بس اپنے اعمال کی اصلاح کرنی چاہیے اور اللہ کے فیصلوں پر راضی رہنا چاہیے۔

ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے۔۔۔

(راحت اندوری کی وفات)

راحت اندوری صاحب کے انتقال کی خبر سن کر بہت دکھ ہوا۔ اندوری صاحب صرف ایک شاعر ہی نہیں تھے، بلکہ وہ انقلابی ذہن رکھنے والی ایک عظیم شخصیت تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعے انقلابی روح پھونکنے کی کوشش کی اور اس دور میں علامہ اقبال کی یادیں تازہ کیں۔ وہ یکم جنوری ۱۹۵۰ء کو ''اندور'' میں پیدا ہوئے اور اسلامیہ کریمیہ کالج اندور سے ۱۹۷۳ء میں ''بیچلر'' کی تعلیم مکمل کی۔ اس کے بعد ۱۹۷۵ء میں راحت اندوری صاحب نے ''برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال'' سے اردو ادب میں ''ایم، اے'' کیا۔ پھر ۱۹۸۵ء میں مدھیہ پردیش کی ''بھوج اوپن یونیورسٹی'' سے اردو ادب میں ''پی ایچ ڈی'' کی ڈگری حاصل کی۔

وہ ایک انقلابی شاعر اور اچھے مصنف تھے۔ اپنی شاعری کے ذریعے پوری دنیا میں متعارف ہوئے اور مشاعروں کے بڑے بڑے اسٹیجوں سے انہوں نے خطاب کیا۔ آج (۱۱/اگست ۲۰۲۰ء بروز منگل) تقریباً ۷۰/سال کی عمر میں وہ اس دنیا کو چھوڑ کر چلے گئے۔ شاعر کبھی مرتا نہیں ہے، بلکہ اپنے مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے؛ لہٰذا یہ کہنا بجا ہوگا کہ اندوری صاحب آج بھی

ہمارے درمیان موجود ہیں۔ ان کے اشعار، ان کی نظمیں اور ان کے افکار و خیالات آج بھی ہمارے ذہنوں میں گردش کر رہے ہیں اور ہمیشہ کرتے رہیں گے۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے، قبر میں کروٹ کروٹ چین وسکون عطا فرمائے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، پس ماندگان اور محبین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

مسلمانوں کو وندے ماترم کیوں قبول نہیں؟

''آئین ہند'' تمام لوگوں کو یہ حق دیتا ہے کہ یہاں کے کسی بھی بسنے والے پر ایسا حکم نافذ نہ کیا جائے جو اس کے مذہبی عقیدے کے خلاف ہو اور جس سے اس کی مذہبی آزادی پر زد پڑتی ہو۔ مادرِ وطن کے سپوت ہونے میں ہندو مسلم اور عیسائی وغیرہ سب برابر ہیں۔ یہاں جس طرح ایک ہندو کو مورتی پوجا سے نہیں روکا جاسکتا اسی طرح کسی مسلمان کو بھی اللہ کے علاوہ کسی دوسری چیز کی عبادت کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

مسلمان ہندوستان کی تعریف اور اس کی خوبیوں پر مشتمل کسی ترانے یا گیت کے مخالف نہیں ہیں، بلکہ ایسے ترانوں کو شوق سے پڑھتے اور گنگناتے ہیں؛ یہاں کا قومی ترانہ ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' ہندوستان کے بارے میں مسلمانوں کے حقیقی جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔ اس طرح کے ترانے پڑھنے میں مسلمانوں کو نہ کبھی کوئی اعتراض ہوا ہے اور نہ ہوسکتا ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کو ایسے ترانے پڑھنے پر مجبور نہ کیا جائے جو ان کے عقیدۂ توحید کے خلاف ہوں اور جس سے ان کی مذہبی آزادی پر آنچ آتی ہو۔

''وندے ماترم'' گیت میں چوں کہ مشرکانہ عقائد ہیں، اس لیے مسلمانوں کو اس کے پڑھنے پر اعتراض ہے؛ اور اعتراض کی وجہ یہ نہیں کہ وہ وطن سے محبت نہیں کرتے یا اس کے وفادار نہیں؛ بلکہ اس بنا پر کہ یہ دستور میں ملی ہوئی مذہبی آزادی کے منافی ہے، ہمیں اپنی مذہبی آزادی بہر حال عزیز تر ہے۔

زمانہ کہاں جارہا ہے؟

زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ معاشرے میں بے حیائی اور جنسی آوارگی بھی تیزی کے ساتھ بڑھتی جارہی ہے۔ ہم جنس پرستی کو جواز اور قانونی حیثیت دیا جانا انتہائی افسوس ناک اور باعث شرم ہے۔ اسی خبیث عمل کی وجہ سے ''قوم لوط'' عذاب خداوندی کا شکار ہوئی تھی۔ ہم جنس پرستی نہ صرف عذاب خداوندی کا سبب ہے، بلکہ خلاف فطرت اور اخلاقی اعتبار سے بھی نہایت گھناؤنا اور خبیث عمل ہے۔ آج اپنے آپ کو مہذب اور انسانیت کی ٹھیکے دار قرار دینے والی ''یوروپین'' قومیں اس عمل بد کی نہ صرف تائید کررہی ہیں بلکہ ان کے ممالک میں اس خبیث عمل کو قانونی حیثیت دے کر برسرِ عام شرم وحیا اور انسانیت کا جنازہ نکالا جارہا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ہم جنس پرستی نے پورے ''یوروپین'' معاشرے کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے، اس کے خطرناک نتائج روز بروز سامنے آرہے ہے۔ اب ہمارا ملک بھی ''یورپ'' کی روش پر چلنے کی کوشش کررہا ہے، ہمارے ملک میں اس خبیث عمل کو جواز اور قانونی حیثیت دیا جانا انتہائی افسوس ناک ہے؛ اس کے خطرناک نتائج عنقریب سامنے آئیں گے اور ہمارا معاشرہ اور تہذیب بھی یورپ کی طرح تباہ ہوجائے گی۔ عجیب بات یہ ہے کہ بے غیرت اور بے ضمیر ''میڈیا'' نے پورے عالم میں ایسا ماحول بنادیا ہے کہ اگر کوئی شخص اس عمل کی برائی اور اس کے خطرناک نتائج بیان کرے تو اس کے خلاف ہی مباحثے اور تبصرے شروع ہوجاتے ہیں، جو لوگ ہم جنس پرستی کو بیماری قرار دے رہے ہیں ان کو ہی بیمار ذہنیت کا حامل قرار دیا جارہا ہے، یعنی اس بارے میں اظہار رائے بھی ایک جرم بن گیا ہے۔

اور جب شام جل رہا تھا۔۔۔

اے شام! ہر آنے والی نسل تجھ سے پوچھتی رہے گی کہ آخر تیرا کیا قصور تھا، جس کی وجہ سے تجھے تباہ و برباد کر دیا گیا؟ تیری سرزمین کو خون سے رنگین کر دیا گیا؟ تیرے بسنے والوں کو زندہ جلا دیا گیا؟ معصوم بچوں کو پتھروں میں پیس دیا گیا؟ جن کی لاشوں کو اٹھانے والا بھی کوئی نہیں تھا؟ تیری تاریخی اور پرشکوہ عمارتوں کو کھنڈرات میں تبدیل کر دیا گیا؟ تیرے جنت نما شہر حلب، ادلب، حماۃ اور غوطہ وغیرہ کو جہنم نما بنا دیا گیا؟ آخر یہ تیرے کس قصور کی سزا تھی؟ کیا تیرا یہ قصور تھا کہ تو بڑے بڑے انبیاء کا مولد و مسکن رہا ہے؟ کیا تیرا یہ قصور تھا کہ تو بہت سے انبیاء کی آرام گاہوں کو اپنے سینے میں رکھتا ہے؟ کیا تیرا یہ قصور تھا کہ قبلۂ اول تیری ہی سرزمین کا حصہ ہے؟ کیا تیرا یہ قصور تھا کہ آخری زمانے میں ہونے والی جنگ عظیم کے دوران مسلمانوں کا مرکز تیرا ہی شہر ''غوطہ'' ہوگا؟ کیا تیرا یہ قصور تھا کہ میدان محشر تیرے ہی یہاں قائم ہوگا اور پوری دنیا سے انسانوں کو کھینچ کر تیری ہی طرف لایا جائے گا؟ اگر تیرا یہی قصور ہے تو تجھے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ تو انتظار کر ظالموں کی ہلاکت کا اور ان کے خوفناک انجام کا۔ تاریخ انسانی گواہ ہے کہ ظالموں کا ظلم کبھی پھولا پھلا نہیں ہے۔ دنیا نے درندوں کے خوف ناک اور عبرت ناک انجام کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

عنقریب تیری ڈوبتی ہوئی شام کی صبح ہونے والی ہے۔

اے شام! تجھ پر جو ظلم وستم ڈھایا گیا ہے، دنیا اس کو فراموش نہیں کرے گی، یہ خونی داستان نسل درنسل منتقل ہوگی، ہر آنے والا مؤرخ جب ظلم و ستم اور درندگی کی تاریخ مرتب کرے گا تو تجھے نظر انداز نہیں کرے گا اور جلی الفاظ میں یہ لکھے گا کہ: ملک شام کی عوام پر درندہ صفت حکومت وقت نے غیر ملکی طاغوتوں کے ساتھ مل کر وہ ظلم ڈھایا جس کی مثالیں تاریخ انسانی میں بہت ہی کم ہیں، دنیا کی تاریخ میں چشم فلک نے ایسے مناظر بہت ہی کم دیکھے ہیں۔ اے شام! آج تجھے جلتا ہوا دیکھ کر پوری انسانیت شرم سار ہے، دنیا کے سبھی حساس دل غمگین اور افسردہ ہیں، زبانیں گنگ اور آنکھیں اشک بار ہیں؛ خدا تجھ پر رحم فرمائے۔

ایک روایت کے بارے میں وضاحت

آج کل ''سوشل میڈیا'' پر ایک روایت بہت تیزی کے ساتھ پھیلائی جارہی ہے اور وہ یہ ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت میں ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ علماء کی پہچان اچھے لباس سے ہوگی، قرآن کی پہچان اچھے قاری سے ہوگی، عبادت صرف ماہ رمضان میں ہوگی؛ جب ایسا ہوگا تو میری امت پر ظالم بادشاہ مسلط ہوں گے ان کے پاس نہ علم ہوگا، نہ حلم اور نہ رحم ہوگا۔

یہ روایت تلاش وتتبع کے بعد احادیث کی معتبر اور مستند کتابوں میں نہیں ملتی ہے۔ البتہ یہ روایت ''بحار الانوار'' میں موجود ہے اور شاید ''بحار الانوار'' ہی کے حوالے سے اس کو شائع کیا جارہا ہے۔ واضح رہے کہ یہ کتاب شیعوں کی ہے اور شیعہ اس کتاب کو اپنی مستند کتاب مانتے ہیں۔ یہ کتاب درجنوں جلدوں میں بیروت سے شائع ہوئی ہے، جو غالی شیعہ ملا باقر مجلسی کی ہے، جس کو شیعہ اپنا بہت بڑا امام اور خاتم المحدثین مانتے ہیں۔ یہ کتاب محض اباطیل اور جھوٹ پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کی جلد ۲۲ صفحہ ٤٥٤ پر مذکورہ روایت بغیر سند کے اس طرح لکھی ہوئی ہے: **قال النبی صلی اللہ علیہ و الہ : سیأتي زمان علی أمّتي لا یعرفون العلماء إلّا بثوب حسن، و لا یعرفون القرآن إلّا بصوت حسن، و لا یعبدون اللہ إلّا في شھر رمضان، فإذا کان کذلک سلّط اللہ علیھم سلطاناً لا علم له، و لا حلم له، و لا رحم له۔**

یہ اس کے الفاظ ہیں اور کوئی سند مذکور نہیں ہے۔ یہ روایت من گھڑت ہے۔ حاشیے میں ''جامع الاخبار'' کا حوالہ دیا گیا ہے، وہ بھی شیعہ کی کتاب ہے۔

گستاخ رسول کی توبہ قبول کی جائے گی یانہیں؟

(ایک شبہ کی وضاحت)

مشہور حنفی عالم صاحب ''فتاوی بزازیہ'' نے لکھا ہے کہ: جو آدمی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی کرے وہ ہمارے نزدیک واجب القتل ہے اور اس کے دوبارہ اسلام لانے کے دعوے کے باوجود اس کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی۔ اس قول کو انہوں نے قاضی ابوالفضل عیاض بن موسی المالکی کی ''کتاب الشفاء'' اور شیخ تقی الدین احمد بن عبدالحلیم ابن تیمیہ حنبلی کی شہرہ آفاق تصنیف ''الصارم المسلول'' کی طرف منسوب کیا ہے۔ صاحب فتاوی بزازیہ کے بعد جتنے بھی مصنفین آئے، سب نے آنکھ بند کرکے اس قول کو حنفیہ کے مذہب کے طور پر نقل کیا ہے، حتی کہ صاحب فتح القدیر علامہ ابن ہمام اور صاحب الدرروالغرر علامہ محمد بن فراموز نے بھی یہی بات لکھی ہے۔ ہوا یہ کہ اسی کو احناف کا مسلک سمجھا جانے لگا اور آج بھی بعض لوگ انہی عبارتوں کو سامنے رکھ کر حنفیہ کا یہی مسلک بیان کرتے ہیں۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ گستاخ رسول کی توبہ قبول نہ کیے جانے کا مسلک شافعیہ، حنابلہ اور بعض مالکیہ کا ہے، احناف کا یہ مذہب نہیں ہے۔ احناف کا مسلک اس سلسلے میں یقینی طور پر یہ ہے کہ ایسا شخص عام مرتد کے حکم میں ہے، اگر وہ توبہ کرے گا تو اس کی توبہ قبول کی جائے گی، جیسا کہ دیگر

مرتدوں کی توبہ قبول کی جاتی ہے۔ احناف کا یہ مذہب متقدمین کی کتابوں میں وضاحت کے ساتھ مذکور ہے۔ جیسے امام ابو یوسف کی ''کتاب الخراج''، علامہ اسبیجابی کی ''شرح مختصر الطحاوی'' اور امام سغدی کی ''النتف'' وغیرہ۔ علامہ شامی نے ''رسم المفتی'' میں اس کی وضاحت کی ہے اور علامہ شامی نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ **''تنبیہ الولاۃ والحکام علی احکام شاتم خیر الانام''** کے نام سے تحریر فرمایا ہے، جو ''رسائل ابن عابدین'' میں شامل ہے۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا دورِ حکومت خلافت ہے یا ملوکیت؟

اللہ تعالی کے احکام بندوں تک پہنچانے، دنیا میں خدا کا قانون نافذ کرنے اور عدل وانصاف قائم کرنے کے لیے اللہ نے زمین میں جن بندوں کو بھیجا ہے، وہ اللہ کے نبی اور خلیفہ کہلاتے ہیں۔ چناں چہ سب سے پہلے نبی اور خلیفہ آدم علیہ السلام ہیں، پھر یہ سلسلہ درجہ بدرجہ چلتے ہوئے آخر میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سب سے آخری نبی اور خلیفہ ہیں۔ آپ کے بعد کوئی نبی یا خلیفہ اللہ کی طرف سے نہ آیا ہے اور نہ آئے گا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد احکامِ الٰہی کو نافذ کرنے اور عدل وانصاف قائم کرنے کے لیے جو منتخب ہو، وہ ''خلیفۃ الرسول'' اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نائب ہے۔ اور خلافت پوری دنیا میں ایک ہی ہوتی ہے، البتہ ملوکیت وبادشاہت متعدد ہو سکتی ہے۔ چناں چہ ایک ہی زمانے میں علاقے کے لحاظ سے متعدد سلاطین اسلام ہوئے ہیں۔ ملوکیت بھی خلافت کی طرح ایک عہدہ اور ذمہ داری ہے، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر خلافت کے ساتھ ساتھ بادشاہت کی شان بھی موجود تھی۔ نیز ملوکیت وبادشاہت بھی اللہ کی طرف سے ایک تحفہ اور انعام ہے، جیسا کہ سلیمان علیہ السلام نے "ھبْ لِیْ ملکًا" کی دعا

کی تھی اور اللہ نے ان کو خلافت کے ساتھ ساتھ بادشاہت بھی عطا کی تھی، جس پر دلالت کرنے والی قرآن میں بہت سی آیتیں موجود ہیں۔ لہٰذا بادشاہت فی نفسہ مذموم شئ نہیں ہے۔

الغرض جب آسمانی خلافت اور بادشاہت ختم ہوگئی، تو دنیا کی خلافت اور بادشاہت کا سلسلہ شروع ہوا؛ چناں چہ خلفائے راشدین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین اور خلیفہ ہیں۔ خلیفہ بنانے کے مختلف طریقے عہد صحابہ میں پیش آئے، ایک طریقہ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے انتخاب کا تھا کہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان کو بالاتفاق اپنا امیر اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ مقرر کیا۔ اور دوسرا طریقہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے انتخاب کا تھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے اخیر زمانے میں بغیر کسی شوریٰ کے حضرت عمر کو اپنا جانشین اور خلیفہ بنادیا۔ پھر تیسرا طریقہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے انتخاب کا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات سے پہلے ایک ''شوریٰ'' قائم کی، جس کے انتخاب سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ مقرر ہوئے۔ اور چوتھا طریقہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے انتخاب کا تھا کہ حضرت عثمان غنی کی شہادت کے بعد اکثر صحابہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کو اپنا امیر تسلیم کیا۔ اسی طرح ایک پانچواں طریقہ وہ ہے جو صحابیٔ رسول حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹے ''یزید'' کو اپنا جانشیں اور خلیفہ بنایا۔ الغرض یہ سب کے سب طریقے عہد صحابہ میں پیش آئے ہیں۔ اور بادشاہت کا طریقہ بھی اسلام میں موجود ہے، پس اُسے منسوخ نہیں کہا جاسکتا۔

اس تمہیدی کلام کے بعد حضرت امیر معاویہ کے دور حکومت کو خلافت

کہا جائے گا یا ملوکیت و بادشاہت؟ اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جو بھی دنیا میں ''احکام الٰہیہ'' کو نافذ کرے گا اور عدل و انصاف قائم کرے گا، وہ خلیفہ کہلائے گا؛ اور یہ پوری دنیا میں ایک ہی ہوگا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی دست برداری اور ارباب حل وعقد کے اتفاق کے بعد حضرت معاویہ کو خلیفہ بنایا گیا، لہذا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ بلا شبہ خلیفہ ہوئے۔ اور خلافت کے بارے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پیش گوئی فرمائی تھی کہ میرے بعد خلافت تیس سال رہے گی، اس کے بعد کاٹ کھا جانے والی ملوکیت آ جائے گی۔ (یہ مدت حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے دور خلافت پر ختم ہو جاتی ہے، امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا دور اس کے بعد شروع ہوتا ہے) اولاتو یہ کہ بعض علماء نے اس حدیث کی سند پر کلام کر کے اسے غیر صحیح قرار دیا ہے۔ چناں چہ قاضی ابوبکر ابن العربی فرماتے ہیں: **ھذا حدیث لا یصح**، یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ (العواصم من القواصم ۲۰۱) دوسرے یہ کہ بعض علماء نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث مجمل ہے اور اس میں تیس سال کے بعد ایک عمومی حکم بیان فرمایا گیا ہے، ہر ہر فرد کی تفصیلات نہیں بیان کی گئیں ہیں؛ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز کا دور حکومت اس سے بالاتفاق مستثنیٰ ہے۔

خلفائے راشدین اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت میں کچھ فرق بھی نظر آتا ہے۔ حضرت معاویہ کے عہد خلافت میں بہت سے ایسے امور واقع ہوئے، جو خلفائے راشدین کے عہد میں مانوس نہیں تھے؛ جن علماء نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کو ''ملوکیت'' سے تعبیر کیا ہے، ہوسکتا ہے اسی فرق کو ملحوظ رکھ کر کیا ہو۔ چناں چہ حافظ ابن حجر ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ سے جو مروی ہے کہ حضرت معاویہ پہلے بادشاہ ہیں، اس سے یہ وہم نہ کیا جائے کہ حضرت معاویہ کی خلافت صحیح نہ تھی، اس لیے کہ ان کی مراد یہ ہے کہ اگرچہ ان کی خلافت صحیح تھی لیکن اس پر ملوکیت کی مشابہت غالب آ گئی تھی، اس لیے کہ وہ بہت سے معاملات میں خلفائے راشدین کے طریقوں سے نکل گئی تھی، لہذا خلافت کی بات اس لیے صحیح ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی دست برداری اور اہل حل وعقد کے اتفاق کے بعد حضرت معاویہ کی خلافت حق اور صحیح تھی، اور ملوکیت کی بات اس لیے درست ہے کہ ان کے عہد حکومت میں کچھ ایسے امور واقع ہوئے جن کا منشاء غلط اجتہاد تھا، جس کی بنیاد پر مجتہد گناہ گار تو نہیں ہوتا لیکن اس کا رتبہ بہر حال ان لوگوں سے گھٹ جاتا ہے جن کے اجتہادات صحیح اور واقع کے مطابق ہوں، اور یہ حضرات خلفائے راشدین اور حضرت حسن رضی اللہ عنہم تھے۔ لہذا جو شخص حضرت معاویہ کے عہد حکومت پر ''ملوکیت'' کے لفظ کا اطلاق کرتا ہے اس کی مراد یہ ہوتی ہے کہ ان کی حکومت میں مذکورہ اجتہادات واقع ہوئے، اور جو شخص اسے خلافت قرار دیتا ہے اس کی مراد یہ ہوتی ہے کہ حضرت حسن کی دست برداری اور اہل حل وعقد کے اتفاق کے بعد وہ خلیفہ برحق اور واجب الاطاعت تھے اور اطاعت کے لحاظ سے لوگوں پر ان کے وہی حقوق تھے جو ان سے پہلے خلفائے راشدین کو حاصل تھے۔ (الصواعق المحرقہ ۱۳۱ مصر)

علامہ ابن حجر ہیثمی کی بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت معاویہ اور خلفائے راشدین کے عہد حکومت میں فرق تو بیشک تھا، حضرت معاویہ کی حکومت اس معیار کی نہیں تھی جو معیار خلفائے راشدین کو حاصل تھا؛ لیکن

جمہور امت کے نزدیک یہ فرق اتنا بڑا نہیں تھا کہ ایک طرف تقویٰ ہو اور دوسری طرف فسق و فجور، یا ایک طرف عدل ہو اور دوسری طرف ظلم و جور؛ بلکہ یہ فرق عزیمت و رخصت کا، تقوی اور مباحات کا، احتیاط اور توسع کا، اصابت رائے اور قصور و اجتہاد کا تھا۔ جن لوگوں نے اس فرق کا لحاظ کیا انہوں نے ان کی حکومت کو ''ملوکیت'' کا نام دے دیا اور جن لوگوں نے یہ دیکھا کہ یہ فرق فسق و فجور کی حد تک نہیں پہنچا تھا انہوں نے اسے ''خلافت'' ہی قرار دیا۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حضرت معاویہ خلیفہ ہونے کے ساتھ ایک بہترین بادشاہ بھی تھے، نیز ایک ہی شخص میں خلیفہ ہونے کے ساتھ ساتھ بادشاہ کی صفات کا موجود ہونا کوئی مستبعد نہیں ہے۔ ملوکیت و بادشاہت بھی خلافت کی طرح ایک عہدہ اور ذمہ داری ہے، اور ملوکیت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک تحفہ اور انعام ہے۔

اب جمہوریت کو بچاؤ!

۱۵؍اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان غیر ملکی انگریزوں کے جبرا تسلط سے آزاد ہوا تھا اور ۲۶؍جنوری ۱۹۵۰ء میں اس ملک کا ''آئین'' نافذ ہوا تھا، اسی وجہ سے ۲۶؍جنوری کو ''یوم جمہوریہ'' کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اس آئین کے تحت ہندوستان کو جمہوری ملک قرار دیا گیا تھا اور اس آئین میں بلاتفریق سبھی اقوام و مذاہب کو مساوات کا درجہ، تحفظ، مذہبی آزادی اور ہندوستان کی آزاد فضا میں آزادی کے ساتھ سانس لینے کا حق بھی فراہم کیا گیا تھا۔ اس لیے کہ اس ملک کی آزادی کے حصول میں درپیش مصائب و مشکلات میں بلاتفریق سبھی مذاہب و برادری کے افراد شریک تھے اور ان سبھی کا خیال تھا کہ ہم سب مل کر ایک ایسے ''بھارت'' کی تعمیر کریں گے جس میں کسی ہندو، مسلم، برہمن، دلت اور کسی بھی ذات و برادری کا امتیازی فرق نہ رہے۔

ہندوستان میں انتخابات کو ''جمہوریت'' کا تہوار کہا جاتا ہے، لیکن اس جمہوری تہوار کو منانے کا ڈھنگ گزشتہ چند سالوں سے مختلف ہو گیا ہے۔ جہاں تک مختلف پارٹیوں کے انتخاب لڑنے کے طریقے اور حکمت عملی کا سوال ہے تو یہ ایک ایسے ڈگر پر چل پڑی ہیں جو نہ صرف مسلمانوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے بلکہ ہندوستان کے مستقبل کے لیے بھی ایک ناسور بنتا جارہا ہے۔

دنیا کے کسی بھی ترقی یافتہ ملک میں جب ''انتخابات'' آتے ہیں تو وہاں

کی جماعتوں کا ایجنڈا ملک کی ترقی، عوام کی فلاح و بہبود، ملک کو درپیش قومی و بین الاقوامی، خارجی اور داخلی مسائل ہوتے ہیں؛ مگر یہ ہندوستان کی بدنصیبی ہے کہ جب بھی الیکشن آتا ہے تو ذات، برادری، ادنی، اعلی اور اقوام و مذاہب کی سیاست کا بازار گرم ہوجاتا ہے اور وہ مسائل جو قومی اور ملکی مفاد کے لیے ہونے چاہیے تھے وہ پس پشت چلے جاتے ہیں۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں:

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

انتخابات کا زمانہ قریب ہے، تمام پارٹیاں اقتدار میں آنے کے لیے اپنی پوری کوششیں صرف کر رہی ہیں؛ ایسے وقت میں مسلمانوں اور سیکولر عوام کے لیے سب سے بڑا مسئلہ ہندوستان کی جمہوریت اور قومی یکجہتی کو بچانے کا ہے، ملک کو فرقہ پرستی، ظلم اور دہشت گردی سے پاک کرنے کا ہے، حق وانصاف کے حصول کا ہے، گنگا جمنی تہذیب اور ہندو مسلم اتحاد کو بچانے کا ہے: اور اس میں ہم کامیاب ہوسکتے ہیں، مگر اس کے لیے ایک منظم حکمت عملی کی ضرورت ہے۔

اگر ''سیکولر ووٹ'' بالخصوص مسلم ووٹ ذات، برادری، مفاد پرستی اور دوستی یاری کی وجہ سے منتشر ہوگئے تو فرقہ پرست طاقتیں کامیاب ہوجائیں گی۔ اس لیے سیکولر عوام بالخصوص مسلم ووٹروں کی ذمہ داری ہے کہ آنے والے انتخاب میں فرقہ پرست طاقتوں کے مقابلے میں سیکولر پارٹیوں کے جیتتے ہوئے امیدواروں کو دیکھ بھال کر ایک جٹ ہوکر کامیاب بنائیں، کیوں کہ ''سیکولر'' کی جیت جمہوریت، قومی یکجہتی اور ہندو مسلم اتحاد کی جیت ہے۔

امداد الفتاوی جدید مطول حاشیہ

(تعارف وتبصرہ)

آج ایک تقریب سعید میں شرکت کی سعادت میسر ہوئی، جس میں اکابر علماء کے مبارک ہاتھوں سے ''امداد الفتاوی جدید مطول حاشیہ'' کا اجرا کیا گیا۔ یہ بات اہل علم سے مخفی نہیں ہے کہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے علوم ومعارف کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے، اور آپ کا انداز تحریر اور انداز فتویٰ نویسی بھی غیر معمولی اور انفرادی اہمیت کا حامل ہے۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے بے شمار علمی و فقہی سوالات کیے جاتے تھے، جن کے جوابات مرتب کر کے آپ ماہنامہ ''النور'' میں شائع فرماتے تھے۔ ایک لمبے زمانے تک یہ سلسلہ جاری رہا اور رفتہ رفتہ مسائل کا ایک بڑا علمی ذخیرہ تیار ہو گیا۔ بعد میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی رحمہ اللہ نے ان مسائل کو مرتب کر کے ''امداد الفتاوی'' کے نام سے چھ جلدوں میں شائع کیا، جو فقہ وفتاویٰ کے میدان میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور برصغیر کے تقریباً ہر دار الافتاء میں اس سے مراجعت اور استفادہ کیا جاتا ہے۔ اگر ہم کو کسی مسئلے میں کوئی صریح حکم فقہی کتابوں میں نہ مل سکے اور امداد الفتاوی میں وہ حکم مل جائے تو آنکھ بند کر کے اس پر فتویٰ دیا جاسکتا ہے، اس لیے کہ امداد الفتاوی کا ہر ہر جواب بڑی گہری تحقیق وتدقیق کے ساتھ حضرت تھانوی

رحمہ اللہ نے دیا ہے۔ بڑے بڑے علمی و تفصیلی سوالات کے جوابات آپ نے مختصر الفاظ میں سمیٹ دیئے ہیں، اور دو دو تین تین لائن کے جوابات بڑی بڑی لمبی تفصیلات کو محیط ہیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ کو بہترین بدلہ عطا فرمائے۔

ایک لمبے زمانے سے علمی حلقوں میں محسوس کیا جارہا تھا کہ ''امداد الفتاوی'' کے مشکل مقامات کی تسہیل ہوجائے۔ نصوص شرعیہ اور عبارات فقہیہ سے مسائل کی تزئین ہوجائے۔ متضاد مسائل کی توجیہ ہوکر کوئی ایک وجہ ترجیح سامنے آجائے، تاکہ ہر کس وناکس کے لیے استفادہ آسان ہوجائے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت استاذ محترم حضرت مولانا مفتی شبیر احمد صاحب دامت برکاتہم کے حق میں مقدر فرمائی اور حضرت والا اس اہم کام کے لیے کمربستہ ہوئے۔ آپ نے بہت ہی مختصر مدت میں امداد الفتاوی پر ایک گہری نظر ڈالی اور تمام مسائل کو نصوص شرعیہ اور عبارات فقہیہ سے مزین کیا، فارسی وعربی عبارتوں کا ترجمہ اور ان کی تسہیل کی، جگہ جگہ مفید حواشی بھی لگائے، انقلاب زمانہ کی وجہ سے جن مسائل کا حکم بدل گیا ہے ان کی بھی دلائل کے ساتھ حاشیہ میں وضاحت کی، اور متضاد مسائل کی بھی نشاندہی فرماکر کوئی ایک وجہ ترجیح ظاہر کی۔ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کی بے پناہ محنتوں اور قربانیوں سے یہ مجموعہ آج ''امداد الفتاوی جدید مطول حاشیہ'' کے نام سے بارہ جلدوں میں منظر عام پر آرہا ہے، جو فقہ وفتاویٰ کے میدان میں ایک بڑے علمی ذخیرے کی حیثیت رکھتا ہے۔

حضرت مفتی شبیر احمد صاحب دامت برکاتہم نے اس مجموعے پر جو کام کیا ہے، اس کی مختصر وضاحت کرتے ہوئے خود مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

(۱) راقم الحروف کے کام کا طریقہ اس طرح سے ہے کہ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ کے سوال وجواب کے مسائل کو قرآنی آیات اور احادیث شریفہ اور فقہی جزئیات کے ذریعہ سے مدلل کیا جائے اور اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ ہر مسئلے کے ذیل میں اس کے موافق یا اس سے قریب کئی کئی نصوص اور جزئیات درج کر کے مدلل کر دیا جائے، تاکہ ناظرین کو حضرت والا تھانوی نور اللہ مرقدہ کے سادہ جوابات یا اصولی اور علمی جوابات کے مآخذ تک رسائی کرنا آسان ہو جائے اور خاص طور پر افتاء پڑھنے والے طلبہ کے لیے مآخذ تک پہنچنا بہت ہی آسان ہو جائے۔

(۲) ہر مسئلے کے ذیل میں روایات اور جزئیات لکھتے ہوئے اب ''امداد الفتاوی'' ۱۲ر جلدوں میں جا کر کے مکمل ہوئی۔

(۳) ہر مسئلے پر تسلسل کے ساتھ نمبر بھی لگایا گیا، جس سے مسائل کے نمبر شمار کل ۳۵۱۴ ہوئے ہیں، جن میں حضرت تھانویؒ کے لمبے لمبے علمی مقالات بھی شامل ہیں۔

(۴) امداد الفتاوی ترتیب جدید من جانب حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کو نسخہ قدیم کا نام دے کر ہر مسئلہ کے ساتھ نسخۂ قدیم صفحہ وجلد کی نشاندہی کی گئی ہے، تاکہ قدیم نسخہ کی طرف مراجعت میں سہولت ہو، اس سے مراد ہندوستانی نسخہ ہے، پاکستانی نسخہ مراد نہیں ہے۔

(۵) فارسی سوال وجواب کے ترجمہ کا خلاصہ اردو میں حاشیہ میں درج کر دیا گیا ہے، کیوں کہ آج کل کے زمانے میں فارسی داں بہت کم ہیں۔

(۶) بہت سے ایسے مسائل جن کا حکم آج کے زمانے میں بدل چکا ہے،

ان کا حکم دلائل کے ساتھ حاشیہ میں واضح کر دیا گیا ہے۔

(۷) متضاد مسائل کی توجیہ کر کے کوئی ایک وجہ ترجیح حاشیہ میں لکھ دی ہے۔

(۸) حضرت والا تھانویؒ نے جن مسائل میں حدیث یا فقہی جزئیہ تحریر فرمایا ہے، ان کا حوالہ جدید نسخوں کے ذریعہ سے حاشیہ میں لکھ دیا ہے، تاکہ جدید نسخوں کے مآخذ حاصل کرنا آسان ہو جائے۔

(۹) حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہ نے ''امداد الفتاوی'' میں عنوانات فارسی میں لگائے تھے، راقم الحروف نے ان فارسی عناوین کا خلاصہ اردو میں کر دیا ہے۔

(۱۰) حضرت اقدس مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہ کی ترتیب میں کوئی ترمیم نہیں کی گئی، پس صرف ایک جگہ ''کتاب الجنائز'' چوں کہ ''کتاب الصلاۃ'' اور صلاۃ ہی کے مسائل منثورہ کے درمیان میں آ گئی ہے، اس لیے کتاب الجنائز کو درمیان سے نکال کر آخر میں کر دیا ہے۔

یہ بات بلا تکلف کہی جا سکتی ہے کہ بڑی بڑی لجنات اور اکیڈمیوں کا جو کام ہوتا ہے، وہ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم نے تن تنہا انجام دیا ہے؛ اور فقہ و فتاویٰ کی پوری جماعت کی طرف سے حق ادا کر دیا ہے۔ اس پر حضرت والا بے شمار مبارک بادیوں کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ حضرت کو صحت و عافیت عطا فرمائے، ہم سب کی طرف سے بہترین بدلہ عطا فرمائے اور اس مجموعے کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت سے نوازے؛ مزید اس طرح کے علمی کام کرنے کی حضرت والا کو اور ہم سب کو توفیق عطا فرمائے۔ آمین

فقیہ باپ کی فقیہہ بیٹی

تاریخ اسلام کے صفحات پر ایسی بہت سی خواتین کا تذکرہ ملتا ہے، جو علم وعمل کے اعلی درجات پر فائز تھیں۔ ان ہی میں سے ایک نام ''فاطمہ بنت محمد بن احمد سمرقندی'' کا ہے، جو اہل سنت والجماعت کی خاتون فقیہہ اور حنفی مذہب کی پیروکار تھیں؛ مشہور فقیہ صاحب ''**تحفة الفقهاء**'' **محمد بن احمد سمرقندی** کی صاحبزادی تھیں اور مشہور حنفی فقیہ اور شارح صاحب ''بدائع الصنائع'' علامہ علاء الدین کاسانی کی شریک حیات تھیں۔

فاطمہ سمرقندیہ ''ترکستان'' کے شہر ''کاسان'' میں پیدا ہوئیں، ان کے والد بڑے محدث اور فقیہ تھے، انہیں سے فقہ کا علم حاصل کیا۔ علامہ عبد الحی لکھنوی لکھتے ہیں: فاطمہ بڑی فقیہہ تھیں، اپنے والد سے فقہ کا علم حاصل کیا تھا، ان کی کتاب ''تحفۃ الفقہاء'' کو یاد کرلیا تھا۔ اعلی اخلاق، علم دوستی، طلب علم اور شرائع واخلاقیات کی پابندی کے ساتھ پرورش وتربیت ہوئی؛ بڑی حق گو تھیں، بادشاہوں اور سلاطین کے سامنے اپنی بات دوٹوک انداز میں رکھتی تھیں، یہاں تک کہ سلاطین بعض خاص مسائل میں ان سے مشورہ لیتے تھے؛ انتہائی زیرک تھیں، یہاں تک کہ ان کے والد فتوی دینے سے پہلے اپنی بیٹی کے سامنے پیش کرتے، ان کی رائے معلوم کرتے اور فتوی دونوں کے دستخط کے ساتھ جاری ہوتا

تھا۔خوش خطی میں بھی مشہور تھیں۔(الفوائد البهية)

فاطمہ سے نکاح کرنے کے لیے ان کی علمی ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے بڑے بڑے لوگوں نے رجوع کیا،حتیٰ کہ روم وعرب کے بہت سے مسلم سلاطین اور حاکموں کے پیغامات بھی آئے ،لیکن علامہ سمرقندی خاموش رہے اور کسی کے پیغام کو قبول نہیں کیا۔ ان کے عزیز شاگرد ''ابوبکر بن مسعود کاسانی'' نے بھی دبے الفاظ میں خواہش ظاہر کی،تو شیخ نے فرمایا:تم میری کتاب ''التحفۃ'' کی شرح لکھ دو، اگر وہ مجھے پسند آ گئی تو میں فاطمہ سے تمہارا نکاح کردوں گا۔ ہونہار شاگرد نے شرح لکھنی شروع کی اور بالآخر اپنے استاد کے سامنے ان کی کتاب کی شرح پیش کردی، جسے علمی دنیا فقہ حنفی کی مشہور ومعروف کتاب ''بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع'' کے نام سے جانتی ہے، جو کئی ضخیم جلدوں میں ہے۔ استاد نے خوش ہوکر اپنی صاحب زادی سے ان کا نکاح کردیا اور اس کتاب کی تالیف کو ان کا مہر قرار دیا۔ اسی لیے بعض لوگوں نے کہا ہے: **شَرَحَ تُحفَتَه وَ زَوَّجَهُ اِبنَتَهُ**۔ کہ کاسانی نے اپنے استاد کی کتاب ''التحفة'' کی شرح کی، استاد نے اپنی بیٹی سے ان کا نکاح کردیا۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ علامہ کاسانی نے خود شرح لکھی تھی، جس سے خوش ہوکر ان کے استاذ نے اپنی بیٹی کا نکاح ان سے کیا۔

فاطمہ سمرقندی کا علمی فیض شادی کے بعد بھی جاری رہا، وہ اپنے گھر میں درس کے حلقے لگاتی تھیں، ان سے بہت بڑی تعداد میں مرد اور عورتوں نے استفادہ کیا، ان کے شاگردوں میں خود ان کے شوہر بھی تھے۔

شیخ علاؤالدین ابوبکر کاسانی خود بڑے فقیہ تھے، ان کا لقب ''ملک

العلماء'' تھا، لیکن ان کی بیوی فاطمہ ان سے بڑھ کر تھیں، انہیں فقہ حنفی کی تمام جزئیات یاد تھیں اور اپنے والد کی کتاب ''تحفة الفقهاء'' ازبر یاد تھی۔ سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ علامہ کاسانی کو فتوی دیتے وقت اگر کسی مسئلے میں وہم ہوجاتا تو فاطمہ اس کی تصحیح کردیتی تھیں اور انہوں نے کیا غلطی کی ہے؟ یہ بھی بتادیتی تھیں۔ علامہ کاسانی فتوی لکھتے وقت ان سے رائے لیا کرتے تھے اور ان کے قول کو ترجیح دیا کرتے تھے۔ مؤرخ ابن العدیم لکھتے ہیں: فاطمہ، مذاہب کی تشریح وتطبیق بہت اچھے طریقے سے کرتی تھیں، ان کے شوہر کو کبھی فتوے میں وہم اور خطا کا امکان ہوتا تو وہ ان کی درست رہنمائی کرتی تھیں اور خطا کی وجہ بھی بتادیتی تھیں، پھر وہ اپنے قول سے رجوع کرلیتے؛ ان کے شوہر اسی وجہ سے ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ (اعلام النساء فی عالم العرب والاسلام ۴/ ۹۴)

سوانح نگاروں نے ایک دل چسپ بات یہ لکھی ہے کہ کاسانی اپنے گھر میں اپنے شاگردوں کے سامنے درس دیتے تھے، کوئی شاگرد کوئی ایسا پیچیدہ سوال کر بیٹھتا جس کا جواب کاسانی کو معلوم نہیں ہوتا، تو وہ کسی بہانے سے گھر کے اندر چلے جاتے، تھوڑی دیر کے بعد واپس آکر اس سوال کا جواب دے دیتے؛ جب ایسا کئی بار ہوا تو شاگردوں کو تجسّس ہوا کہ آخر جب استادِ محترم سے کسی سوال کا جواب نہیں بن پڑتا تو گھر کے اندر کیوں چلے جاتے ہیں؟ اور گھر سے آتے ہی کیسے پورے اطمینان کے ساتھ جواب دے دیتے ہیں؟ پتا چلا کہ وہ گھر کے اندر اپنی معلّمہ کے سامنے زانوائے تلمّذ تہہ کرتے ہیں، جو ان کی بیوی بھی ہیں۔

فاطمہ سمرقندیہ نے اپنے شوہر علامہ کاسانی کے ساتھ بہت سے ملکوں کا سفر کیا۔ آخر میں ایوبی سلطان ''صلاح الدین'' کے پاس قیام کیا، وہ ان دونوں کا

بہت احترام و اکرام کرتے تھے، اپنے خاص معاملات میں ان سے مشورے لیتے تھے۔ اسی طرح حلب کے سلطان ''نور الدین زنگی'' بھی فاطمہ کے بہت قدردان تھے، سلطنت کے داخلی امور سے متعلق ان سے مشورہ لیتے تھے اور ان سے جواب حاصل کرنے کے لیے ''حلب'' میں ایک خاتون کو بھیجتے، پھر وہ جواب دیتی تھیں۔

فاطمہ سمرقندی آخر عمر تک حلب میں مقیم رہیں اور حلب میں ہی ۵۸۱ھ میں ان کی وفات ہوئی، وہیں ''مسجد ابراہیم الخلیل'' میں مدفون ہوئیں۔ ان کے شوہر علامہ کاسانی ہر جمعہ کی رات ان کی قبر کی زیارت کرتے تھے، یہاں تک کہ ۶؍سال بعد ۵۸۷ھ میں علامہ کاسانی کی بھی وفات ہوگئی۔ انہوں نے اپنی شریک حیات فاطمہ کی قبر کے بغل میں مدفون ہونے کی وصیت کی تھی۔

ہدایہ اور اس کی اصطلاحات

شیخ الاسلام برہان الدین امام ابوالحسن علی بن ابی بکر مرغینانی مشہور حنفی عالم ہیں۔ آپ نے قدوری اور امام محمد کی ''جامع صغیر'' سے عبارتیں منتخب کر کے فقہ حنفی کا ایک متن تیار کیا تھا، جس کا نام ''بداية المبتدی'' رکھا۔ آپ نے اس کتاب کے دیباچے میں اس کی شرح لکھنے کا بھی وعدہ کیا۔ چناں چہ جب شرح لکھنی شروع کی تو اس کی تکمیل ۸۰ر جلدوں میں ہوئی، آپ نے اس کا نام ''كفاية المنتهی'' رکھا۔ پھر آپ نے سوچا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لوگ طوالت کی وجہ سے اس کتاب کی طرف التفات نہ کریں اور اس سے فائدہ نہ اٹھا پائیں۔ چناں چہ آپ نے اس شرح کی تلخیص کی، جو چار ضخیم جلدوں میں ہوئی، جس کا نام ''ہدایہ'' ہے۔ کتاب ''الہدایہ'' فقہ حنفی کی ایک جامع کتاب ہے، یہ ایجاز کے ساتھ ایضاح کا ایک نادر نمونہ ہے۔ یہ کتاب ہر زمانے میں مقبول ومحمود رہی ہے۔ صاحب ہدایہ نے اس کتاب میں کچھ مخصوص اصطلاحات استعمال کی ہیں، جن کا جاننا ''ہدایہ'' کے طالب علم کے لیے ضروری ہے۔ ان اصطلاحات کی وضاحت مندرجہ ذیل ہے۔

(۱) مصنف رحمہ اللہ کسی مسئلہ کو ثابت کرتے ہوئے سابقہ قرآنی دلیل کی طرف ''لماتلونا'' سے اشارہ کرتے ہیں۔

(۲) سابقہ روایت کی طرف "لماروینا" سے اشارہ کرتے ہیں۔

(۳) حدیث کو "خبر" اور صحابہ کے قول کو "اثر" سے تعبیر کرتے ہیں، کبھی فرق نہیں کرتے۔

(۴) مجموعی اعتبار سے جو دلیل پیچھے گزری ہو، اس کی طرف "لما ذکرنا" سے اشارہ کرتے ہیں۔

(۵) مسئلے کی علت کی طرف "لما بینا" سے اشارہ کرتے ہیں، یعنی "لما ذکرنا" عام معنی میں استعمال کرتے ہیں اور "لمابینا" خاص معنی میں استعمال کرتے ہیں۔

(۶) صاحب ہدایہ اپنی رائے "قال العبد الضعیف" سے پیش کرتے ہیں۔آپ کے تلامذہ نے اس کو "قال رضی اللہ عنہ" لکھ دیا ہے۔

(۷) "مشائخنا" سے ماوراء النہر کے علماء مراد ہیں۔

(۸) "دیارنا" سے ماوراء النہر مراد ہوتا ہے۔

(۹) "عند فلان" کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کا مذہب ہے۔

(۱۰) "عن فلان" کا مطلب یہ ہے کہ ان کا ایک قول ہے۔

(۱۱) "الاصل" سے مراد امام محمد کی کتاب "مبسوط" ہوتی ہے۔

(۱۲) "الکتاب" سے مراد کتاب "قدوری" کا متن ہوتا ہے۔

(۱۳) کسی مسئلے میں اختلاف ہو، تو مصنف صحیح قول کی طرف "ھذا ھو الصحیح" کہہ کر اشارہ کرتے ہیں۔

(۱۴) "اعتبارا بکذا" سے قیاس کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

(۱۵) ھذا فی معناہ، لیس فی معناہ، یلحق بہ، و لا یلحق بہ سے

نص کی دلالت اور عدم دلالت کی طرف اشاہ کرتے ہیں۔

(۱۶) ”اصل هذا“ سے کبھی مسئلہ کی بنیاد کی طرف، کبھی قاعدہ کلیہ وضابطے کی طرف، کبھی مسئلہ کی دلیل کی طرف اور کبھی مقیس علیہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں؛ سیاق وسباق سے اس کی تعیین اور اس کا لحاظ کرنا چاہیے۔

دل کش صبح

(ایک نئے سویرے کی دستک)

جب لیلیٰ شب زلفیں سمیٹتی ہے، اندھیرے کھسکتے ہیں، خاموشی رخت سفر باندھتی ہے، ستارے دم توڑتے ہیں، شبنم پھولوں کو وضو کرانے آتی ہے، روشنی کے لمس سے زندگی کے وجود میں سرشاری دوڑتی چلی جاتی ہے، لمحوں کے چہروں پر رینگتی تاریکیاں چھٹنے کو آتی ہیں اور پو پھوٹنے لگتی ہے۔۔۔ تب پرندے آشیانے چھوڑتے ہیں، ڈالیوں میں بنے نشیمن خالی ہوتے چلے جاتے ہیں، غنچے چٹختے اور گل مہکتے ہیں، صبا بکھرتی اور گلستان نکھرتے ہیں، عندلیب چہکتے اور ہر ذرہ بیاباں چمکنے لگتا ہے۔۔۔ یقیناً کائنات کی بزم میں طلوع سحر کا یہ پرکیف سماں قدرت کے شاہکار مناظر میں سے ہے۔

پھر ہر نئی صبح ایک نئی زندگی لے کر آتی ہے، ہر نیا سویرا ایک نیا پیغام لے کر آتا ہے، انسان صبح کی دل کش اور پرسکون فضا میں جو کیف وسرور محسوس کرتا ہے اس سے نہ صرف روح کو جلا ملتی ہے بلکہ ایک نئی امنگ کا آغاز ہوتا ہے، ہر نئی صبح ایک نئی سوچ پیدا کرتی ہے، افکار وخیالات اور ذہن ودماغ میں وسعت پیدا کرتی ہے۔۔۔ پھر اس کی روشنی میں انسان اپنے دن بھر کا سفر طے کرتا ہے، اور اس سفر کا مدار اس کی صبح کے آغاز پر ہوتا ہے، حضور علیہ السلام نے صبح کے وقت کو برکت سے تعبیر فرمایا ہے۔۔۔

دو قسم کی عورتیں اوران کے ساتھ سلوک

مرد اور عورت ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں، دونوں مل کر انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے، لیکن فطرت نے دونوں کے لیے کچھ اصول اور ضابطے بنائے ہیں، جن کی رعایت ضروری ہے، ان حدود کی خلاف ورزی کی صورت میں نظام کائنات متأثر ہوتا ہے، جب کہ خالق کائنات نظام کائنات کو درست دیکھنا چاہتا ہے؛ ایک بنیادی اصول عورت کے لیے پردہ اور مرد وعورت کے لیے نگاہیں نیچی رکھنا ہے۔ معاشرتی زندگی میں کوئی بھی مرد جب باہر نکلتا ہے تو اسے دو قسم کی عورتوں سے سابقہ پڑتا ہے۔

پہلی قسم: وہ عورت جو عزیز مصر کی بیوی والے مرض میں مبتلا ہوتی ہے۔ بن سنور کر، خوشبوؤں میں نہا کر، بے پردہ ہوکر، بے حیا بن کر باہر اس لیے نکلتی ہے تا کہ وہ مردوں کی نگاہوں کی زینت بنے؛ اور زبان حال سے کہہ رہی ہوتی ہے، **هيت لك**۔

دوسری قسم: وہ عورت جو باپردہ، باحجاب اور شرم وحیا کا پیکر ہوتی ہے، حالات نے اسے حاجتوں اور ضرورتوں کی انجام دہی کے لیے باہر نکلنے پر مجبور کیا ہے، وہ اس حالت میں باہر نکلتی ہے کہ کوئی بھی مرد اس کی طرف متوجہ نہ ہونے پائے، اس کی زبان حال اس طرح گویا ہوتی ہے، **حتى يصدر الرعاء**

و أبو نا شيخ كبير۔

پہلی قسم کی عورت کے ساتھ حضرت یوسف علیہ السلام والا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے، نگاہوں میں سرمۂ حیالگا کر جھکائے رکھنا چاہیے اور کہنا چاہیے: معاذ اللہ۔ دوسری قسم کی عورت کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے طرز عمل کو اختیار کرنا چاہیے، بہت ہی ادب واحترام کے ساتھ خدمت پیش کر کے اپنی راہ اپنانی چاہیے، **فسقى لهما ثم تولى إلى الظل۔**

حضرت یوسف علیہ السلام کی عفت و پاکیزگی نے ان کو حاکم مصر بنایا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خودداری اور باوقار خدمت کے سبب اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے راستے کھولے، بے سروسامانی کے عالم میں ٹھکانہ اور نیک صالح بیوی عطا فرمائی۔

تاریخ کے جھروکے سے۔۔۔

تاتاری لشکر:

تاتاری ایک ایسا بادل تھے جس کو ہوا تیزی سے ادھر ادھر لیے پھرتی تھی، یہ ''چین'' سے نکلے اور بہت جلد ان کے ہاتھوں سے ترکستان کے شہر کاشغر وغیرہ تباہ ہوئے، جب یہ بخارا اور سمرقند پہنچے تو ان کو تباہ کرڈالا، جب خراسان پہنچے تو وہاں بھی تباہی اور ہلاکت لائے، یہاں جی بھر کر قتل وغارت گری کرنے کے بعد رے اور ہمدان کا بھی یہی حشر کیا۔ عراق میں پہنچ کر وہاں سے آذربائیجان روانہ ہوئے تو تمام علاقوں کو تباہ کرکے رکھ دیا، ان تمام پُر رونق اور آباد شہروں کو ایک ہی سال میں برباد کردیا، جب یہ آذربائیجان سے نکلے تو دربند شروان پہنچے اس کو برباد کیا، پھر وہاں سے لدن اور الکر گئے اور ان کو جلا کر خاکستر کرڈالا، ہزاروں کو قتل، ہزاروں کو قید کیا۔ تاتاری لشکر کا ایک حصہ غزنی، سجستان اور کرمان کی طرف چلا گیا اور ان شہروں پر ایسے مظالم ڈھائے کہ تاریخ میں نظیر ملنا مشکل ہے۔ بالآخر ان تاتاریوں نے دنیا کے عظیم حصے کو فتح کرلیا اور ان کا دبدبہ تمام دنیا پر قائم ہوا کہ کوئی شہر ایسا نہیں تھا جہاں ان کے نام سے لوگ نہ کانپتے ہوں۔ انہوں نے روس، یورپ اور وسط ایشیا سمیت ہر جگہ انسانوں کو اپنا نشانہ بنایا؛ البتہ مسلمان ان کے فتنے کا زیادہ شکار بنے اور مسلمانوں نے بڑی تباہی اٹھائی، بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ آئے ہی تھے اسلامی سلطنت اور تہذیب کو مٹانے کے لیے۔ ان کے مظالم قدیم تاریخ کے سب سے بڑے ظالم

حکمراں ''بخت نصر'' سے بھی بڑھے ہوئے تھے۔

بغداد کی تباہی:

بغداد کوئی چھوٹا موٹا شہر نہ تھا، چالیس روز تک اس کے وجود کو نوچا جاتا رہا، چن چن کر اصحاب علم و ہنر وتہذیب کو قتل کیا جاتا رہا، تا کہ اسلام کی فکری اور تمدنی بنیادوں کو مسمار کر دیا جائے؛ بغداد کی لاکھوں کتابوں پر مشتمل عظیم الشان لائبریری کو جلا کر راکھ کر دیا گیا، یہاں تک کہ دریا کا پانی جہاں یہ جلتی ہوئی کتابیں غرقابی کے لیے ڈالی گئی تھیں، ہفتوں تک سیاہ رنگ رہا؛ تا تاری لشکر نے قتل، عورتوں کی عصمت دری، لوٹ مار، سختی، مکانات ومحلات کی تباہی کے تمام سابقہ ریکارڈ مات کر دیے۔ تا تاریوں کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ کہیں کوئی عمدہ عمارت اور تہذیبی نشان سلامت نہ رہے، اس سلسلے میں وہ آگ لگانے کے بہت شوقین تھے، عمارتوں سے اٹھتا دھواں دیکھ کر انہیں شراب کے برابر نشہ حاصل ہوتا تھا۔

بغداد کی بربادی:

بغداد کی تا تاریوں کے ہاتھوں بربادی مسلمانوں کی ڈیڑھ ہزار سالہ تاریخ کا سب سے المناک واقعہ ہے، اس تباہی پر شاعروں نے برسوں دل دوز مرثیے لکھے اور آج تک یہ ماتم جاری ہے۔ سعدی شیرازی نے کہا: '' آسمان را حق بُوَد گر خوں ببارد برزمیں'' (اس واقعہ پر اگر آسمان سے خون کی بارش ہوتو یہ ٹھیک بات ہوگی)۔ بغداد کی بربادی پر عربی میں بھی بے شمار مرثیے لکھے گئے، ان میں ایک شاعر کا ایک شعر بہت مشہور ہوا، جس کا ترجمہ یہ ہے: بغداد اور اہلِ

بغداد گھر بار کے ساتھ برباد ہوئے، ان کے گھروں کو ہمارے وزیر نے تباہ کر دیا، بنوعباس کو یہ سزا بیٹھے بٹھائے نہیں مل گئی تھی، یہ ان کے اعمال کی شامت تھی، جب حکم راں اور قوم اپنے ملک کی سرحدوں کی حفاظت اور دفاع سے قاصر ہو جاتے ہیں، تو اسی طرح تاریخ کا رزق بنتے ہیں کہ مدتوں کسی کی آنکھ نم بھی نہیں ہوتی، ہمدردی کے دو لفظ بھی میسر نہیں آتے۔

سقوط بغداد:

وہ اتوار کا دن ۶۵۵ھ صفر المظفر کی چار تاریخ تھی، جب بغداد کا سقوط ہوا، ''ہلاکو خان'' نے لشکر کو حکم دیا کہ بغداد کے اندر اور باہر جو کچھ ہے تاخت و تاراج کر دیا جائے؛ سب سے پہلے انہوں نے خندق کو مسلمان مقتولین کی لاشوں سے پاٹ کر سڑک کی زمین کے برابر کر ڈالا، اس کے بعد بھوکے بھیڑیوں کی طرح شہریوں پر ٹوٹ پڑے، شہر کی نالیوں سے گندے پانی کی جگہ خون بہنے لگا، جو دریائے دجلہ میں شامل ہو گیا۔ مسلمان مورّخین نے لکھا ہے کہ بیس لاکھ مسلمان فوجی، مرد و زن، بچے اور بوڑھے قتل کیے گئے، مغربی مصنفین کے مطابق ایک لاکھ یا کم و بیش افراد قتل ہوئے۔ خاص شاہی خزانوں اور محلات کو لوٹ کر جھاڑ و پھیر دی گئی، محلات کے کنگرے تباہ کر دیے گئے، وہ مکانات اور شبستان جو بہشتِ بریں کے ایوانوں کا تصور پیش کرتے تھے اجاڑ دیے گئے، عظیم الشان قلعے گلیوں کی خاک کے برابر کر دیے گئے۔

تاتاریوں کی حالت:

تاتاریوں کو نہ کسی مدد کی ضرورت تھی اور نہ رسد کی۔ رسد میں سب سے

اہم گوشت ہوتا ہے، وہ ان کے پاس بھاری مقدار میں موجود تھا، بھیڑ بکریاں ان کے ساتھ ہوتی تھیں، وہ انہیں کاٹ کر کچا پکا گوشت کھا لیتے تھے۔ ان کے گھوڑوں کو چراگاہوں کی حاجت نہ تھی، وہ اپنے سموں سے ایسی جگہ کھود ڈالتے جہاں گھاس کی جڑیں موجود ہوتیں اور وہ ان جڑوں پر گزارہ کرتے، دانہ وغیرہ تو ان گھوڑوں نے کبھی دیکھا نہ تھا۔ ان کے مذہب میں کوئی چیز حرام نہ تھی، تمام جانور بلکہ انسانی گوشت بھی ان کے نزدیک حلال تھا۔ شادی بیاہ اور نکاح کے جھگڑوں میں نہیں پڑتے تھے، ایک عورت کے کئی شوہر ہو سکتے تھے۔

سقوط بغداد اور سقوط دہلی:

کم از کم ایک صدی تک المیۂ بغداد پر بھرپور نوحے اور مرثیے کہے جاتے رہے، شاعر روتے رہے اور رُلاتے رہے، مؤرخ اور ادیب امت کے سامنے اس سانحہ کی تمام جزئیات پیش کر کے غیرت دلاتے رہے۔ لیکن جب ۱۸۵۷ء میں سقوط دہلی ہوا، تو ایک طویل عرصے تک مسلمانوں کے اجتماعی وجود کی بے حسی کی یہ کیفیت تھی جیسے جسم کے فالج زدہ حصے میں ہر قسم کا احساس مفقود ہو جاتا ہے، نہ کسی شاعر نے خاص مرثیہ کہا، نہ کسی مورّخ نے واقعات کی صحیح تصویر کشی کا حق ادا کیا، لے دے کے چند اصحاب نے کچھ لکھا مگر بڑے عرصے بعد؛ غدر غدر کے پروپیگنڈے میں سقوطِ دہلی اور ہندوستان سے مغلیہ سلطنت کے دردناک انجام کو بھلا دیا گیا۔ سقوطِ بغداد اور سقوطِ دہلی کے واقعات میں کئی مماثلتیں ہیں، دونوں شہروں کی رونقیں بھی تقریباً ایک ہی جیسی تھیں۔

فن تاریخ نویسی اور مسلمان

اگر نہایت غور سے تحلیلی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ فن ''تاریخ نویسی''، مسلمانوں کا ہی ایجاد کردہ فن ہے، اگر چہ اہل مغرب اس کا رشتہ ''روم'' اور ''یونان'' سے جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر ''ہیروڈوٹس'' وغیرہ سے جو کچھ منسوب ہے وہ تاریخ کی تعریف پر پورا نہیں اترتا۔ تاریخ کے تین اصول ایسے ہیں جو مسلمانوں نے ہی علمی دنیا کو دیے ہیں: ایک یہ کہ واقعہ کی صداقت کا معیار شہادت کو بنایا؛ دوسرے یہ کہ مسلم علماء نے تاریخ کو ''حولیات'' میں بدلا، جیسے محمد ابن جریر طبری کی تاریخ ہے؛ تیسرے یہ کہ ابتدائی دور کی تاریخوں میں واقعات کو اختلاف روایات کے باوجود قلم بند کیا، تاکہ اہل تحقیق کو محاکمہ کرنے میں آسانی ہو۔

عباسی دور تک آتے آتے تاریخ ایک نہایت وسیع اور مقبول عام فن بن گیا تھا۔ اسے کہیں چھوٹے علاقوں پر تقسیم کیا گیا، جیسے تاریخ یمن، تاریخ حجاز وغیرہ؛ کہیں طبقات میں تقسیم کیا گیا، جیسے طبقات الفقہاء، طبقات الاطباء وغیرہ؛ پھر خاص شہروں کی تاریخ لکھنے کا رواج عام ہوا، جیسے خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد، ابن عساکر کی تاریخ دمشق وغیرہ۔ سرزمین حجاز سے نکل کر مسلمان جہاں بھی گئے یہ فن بھی ان کے ساتھ چلتا چلا گیا۔

انگوٹھی کس ہاتھ میں پہننا سنت ہے؟

انگوٹھی دائیں ہاتھ میں پہننا سنت ہے یا بائیں ہاتھ میں؟ اس سلسلے میں اختلاف ہے۔ علامہ بیجوری اور علامہ مناوی نے ”کان یتختم فی یمینه“ کا باب باندھا ہے، علامہ نووی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے، امام شافعی نے بھی یمین کو افضل اور راجح مانا ہے، امام بخاری اور امام ترمذی کا رجحان بھی یمین ہی کی طرف ہے، ملا علی قاری نے بھی یمین والے مذہب کو مختار مانا ہے۔ لیکن چوں کہ اٹھارہ سے زیادہ روایات یسار کی بھی ہیں اور مضبوط ہیں، اس لیے بعض علماء کا رجحان یسار کی طرف ہے؛ علامہ شامی کی تحقیق کے مطابق احناف کا مسلک یسار ہی کا ہے، علامہ عینی نے بھی اجناس کے حوالے سے احناف کا مسلک یسار کا نقل کیا ہے، امام مالک نے بھی یسار ہی کو مستحب قرار دیا ہے۔ بعض حضرات نے دونوں میں تطبیق دی ہے، چناں چہ فقیہ ابواللیث نے دونوں کو مساوی قرار دیا ہے، علامہ نووی نے بھی دونوں میں بلا کراہت جائز لکھا ہے، بعض نے کہا ہے کہ یمین میں پہننا افضل ہے اور یسار بیان جواز کے لیے ہے، قہستانی نے کہا ہے کہ یمین روافض کا شعار ہو گیا ہے، لیکن علامہ شامی نے اس کی تردید کی اور کہا ہے کہ پہلے تھا اب نہیں ہے۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں بڑی فیصلہ کن اور شاندار بات کہی ہے کہ زینت کے لیے یمین بہتر ہے اور مہر لگانے کے لیے یسار بہتر ہے۔

جب عید کی صبح ہوتی ہے۔۔۔

حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک جامع اور طویل حدیث ہے، جس کو امام منذری نے "الترغیب والترھیب" میں نقل کیا ہے، اس حدیث کے آخر میں یہ الفاظ ہیں کہ: جب عید کی صبح ہوتی ہے تو حق تعالیٰ شانہ فرشتوں کو تمام شہروں کی گلیوں اور راستوں کے کناروں پر کھڑا کر دیتے ہیں اور ایسی آواز سے جس کو جنات اور انسان کے سوا ہر مخلوق سنتی ہے پکارتے ہیں کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت! اس کریم رب کی (بارگاہ) کی طرف چلو جو بہت زیادہ عطا کرنے والا ہے اور بڑے سے بڑے قصور کو معاف فرمانے والا ہے۔ پھر جب لوگ عید گاہ کی طرف نکلتے ہیں تو حق تعالیٰ شانہ فرشتوں سے دریافت فرماتے ہیں: کیا بدلہ ہے اس مزدور کا جو اپنا کام پورا کر چکا ہے؟ وہ عرض کرتے ہیں: اے ہمارے معبود اور ہمارے مالک! اس کا بدلہ یہی ہے کہ اس کی مزدوری پوری پوری دے دی جائے۔ حق تعالیٰ شانہ ارشاد فرماتے ہیں: اے فرشتو! میں تمہیں گواہ بناتا ہوں، میں نے ان کو رمضان، روزوں اور تراویح کے بدلے میں اپنی رضا اور مغفرت عطا کر دی؛ اور بندوں سے خطاب فرما کر ارشاد ہوتا ہے کہ اے میرے بندو! مجھ سے مانگو، میری عزت کی قسم! میرے جلال کی قسم! آج کے دن اپنے اس اجتماع میں مجھ سے اپنی آخرت کے بارے میں جو

سوال کرو گے عطا کروں گا، اور دنیا کے بارے میں جو سوال کرو گے میں تمہاری مصلحت پر نظر کروں گا، میری عزت کی قسم! جب تک تم میرا خیال رکھو گے میں تمہاری لغزشوں پر ''ستاری'' کرتا رہوں گا (اور ان کو چھپاتا رہوں گا) میری عزت وجلال کی قسم! میں تمہیں مجرموں (اور کافروں) کے سامنے رسوا اور ذلیل نہ کروں گا۔ بس اب بخشے بخشائے اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ، تم نے مجھے راضی کر دیا اور میں تم سے راضی ہو گیا۔ پس وہ فرشتے اس اجر وثواب کو دیکھ کر جو اس امت کو افطار کے دن ملتا ہے خوشیاں مناتے ہیں اور کھل جاتے ہیں۔

سورج؛ خانۂ کعبہ کے اوپر

(قبلہ درست کرنے کا بہترین موقع)

ماہرین فلکیات کے مطابق خانہ کعبہ کے اوپر سورج کا آنا اہم واقعہ مانا جاتا ہے۔خانہ کعبہ کے اوپر سورج ہر سال ۲؍مرتبہ آتا ہے۔اگر ''لیپ'' کا سال (۲۹؍فروری) نہ ہوتو پہلی مرتبہ ۲۸؍مئی کو اور دوسری مرتبہ ۱۶؍جولائی کو سورج بیت اللہ کے اوپر سے گزرتا ہے۔ اور اگر ''لیپ'' کا سال (۲۹؍فروری) ہو توسورج بیت اللہ کے اوپر پہلی مرتبہ ۲۷؍مئی کو اور دوسری مرتبہ ۱۵؍جولائی کو آتا ہے۔ جب سورج خانۂ کعبہ کے عین اوپر ہوتا ہے تو خانہ کعبہ کا سایہ ختم ہوجاتا ہے۔

سال ۲۰۲۲ء میں پہلی مرتبہ سورج خانہ کعبہ کے اوپر ۲۸؍مئی سنیچر کے دن آئے گا، جب سورج عین کعبہ کے اوپر ہوگا اس وقت ''گرینچ ٹائم'' ۹؍بج کر ۱۸؍منٹ ہے، سعودی وقت دوپہر ۱۲؍بج کر ۱۸؍منٹ ہے، ہندوستان میں اس وقت ۲؍بج کر ۴۸؍منٹ ہو رہے ہوں گے، پاکستان میں ۲؍بج کر ۱۸؍منٹ ہو رہے ہوں گے۔ مذکورہ وقت کے مطابق اگر کوئی اپنے ملک میں سورج کی طرف رخ کر کے کھڑا ہوجائے تو اس کا قبلہ درست ہوجائے گا۔عرب ممالک اور قطب شمالی کے پڑوسی علاقوں کے باشندے قبلے کی سمت کا تعین کر سکتے ہیں۔

اسی طرح افریقا، یورپ، چین، روس اور مشرقی ایشیا کے باشندے بھی قبلہ کی سمت کا تعین کر سکتے ہیں۔ الغرض جن ملکوں میں سورج نکلا ہوا ہو یعنی دن ہو، وہ لوگ اپنا قبلہ درست کر سکتے ہیں، اور اس وقت جن ملکوں میں رات ہو رہی ہو وہ لوگ سورج دیکھ کر اپنا قبلہ درست نہیں کر پائیں گے۔

ماضی میں قبلے کی سمت متعین کرنے کا جدید ترین طریقہ میسر نہیں تھا، اس لیے ماضی میں لوگ خانہ کعبہ کے اوپر سورج کا منظر دیکھ کر ہی قبلے کی جہت متعین کرتے تھے۔

قبلہ کی درست سمت کے تعین کے لیے اس طرح بھی کر سکتے ہیں کہ مقررہ وقت پر زمین پر ایک چھڑی عمودی گاڑ دیں، جیسے ہی مذکورہ وقت آئے، اس سایہ پر ایک خط کھینچ دیں اور اس خط پر عمود گرائیں، شمال سے جنوب کی جانب ''زاویہ قائمہ'' بنائیں، یہی قبلہ رخ ہوگا۔

معتکف کے غسل کا مسئلہ

معتکف کے لیے ایک اہم مسئلہ غسل کا ہے، کہ وہ مسجد میں اعتکاف کی حالت میں غسل کہاں کرے؟ اس سلسلے میں یاد رکھیں! اگر مسجد شرعی کی حد میں رہتے ہوئے غسل کا ایسا انتظام ہو کہ مسجد غسل کے پانی سے ملوث نہ ہو تو معتکف کے لیے مسجد میں ہر طرح کا غسل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اور اگر مسجد میں ایسا انتظام نہ ہو تو واجب غسل کے لیے مسجد سے باہر نکلنا بالاتفاق جائز ہے؛ البتہ غیر واجب غسل مثلاً بدن کی صفائی یا ٹھنڈک حاصل کرنے کے لیے غسل کرنا، تو اگر اس کے لیے مسجد سے باہر جائے گا تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس کا اعتکاف ٹوٹ جائے گا۔ تاہم اگر بول وبراز کی ضرورت کے لیے مسجد سے باہر نکلا اور وہیں جلدی سے بدن پر پانی بہالیا تو اعتکاف میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔

آج کل مساجد میں جو غسل خانے عموماً بنے ہوئے ہوتے ہیں، وہ مسجد کی ملکیت میں تو ہوتے ہیں، لیکن مسجد شرعی کی حد میں نہیں ہوتے؛ اس لیے واجب غسل کے لیے تو وہاں جاسکتے ہیں، لیکن غیر واجب غسل کے لیے وہاں جانے سے اعتکاف ٹوٹ جائے گا۔

صاحبینؒ کے نزدیک چوں کہ کچھ دیر کے لیے مسجد سے باہر نکلنے سے اعتکاف فاسد نہیں ہوتا ہے۔ بریں بنا جو شخص روزانہ غسل کا عادی ہو کہ اسے غسل کے بغیر چین ہی نہ آتا ہو اور گویا غسل اس کی ضرورت طبعی بن گیا ہو یا گرمی بہت زیادہ سخت ہو رہی ہو، جس کی وجہ سے بدن اور کپڑوں میں بدبو وغیرہ پیدا ہو رہی

ہو،تواس کے لیے صاحبینؒ کے قول پرعمل کرنے کی گنجائش ہے۔

جہاں تک جمعہ کے غسل کی بات ہے۔تو عام فقہی کتابوں اور فتاویٰ میں تو یہی بات لکھی ہے کہ غیر واجب غسل کے لیے مسجد سے باہر نکلنا معتکف کے لیے درست نہیں ہے،اور غیر واجب غسل میں جمعہ کا غسل مسنون بھی داخل ہے؛ لیکن بعض فقہی عبارتوں سے جمعہ کے غسل کے لیے معتکف کو مسجد سے باہر نکلنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔اس لیے ضرورت اور تقاضے کے وقت اس روایت پر عمل کرنے کی گنجائش ہے۔چند فقہی عبارات ملاحظہ ہوں:

وحرم عليه الخروج الا لحاجة الانسان طبيعية كبول وغائط وغسل لو احتلم ولا يمكنه الاغتسال فى المسجد (الدر المختار ۲/ ۴۴۵،۴۴۴)

ثم إن أمكنه الاغتسال فى المسجد من غير أن يتلوث المسجد فلا بأس به وإلا فيخرج ويغتسل ويعود إلى المسجد۔ (الفتاوى الهندية ۱/ ۲۱۳)

فلو أمكنه من غير ان يتلوث المسجد فلا بأس به بدائع، اى بان كان فيه بركة ماء او موضع معد للطهارة او اغتسل فى اناء بحيث لا يصيب المسجد الماء المستعمل۔ قال فى البدائع: فان كان بحيث يتلوث بالماء المستعمل يمنع منه، لان تنظيف المسجد واجب۔ (رد المحتار ۳/ ۴۳۵، بدائع الصنائع زكريا ۲/ ۲۸۷، حاشية الشلبى على التبيين ۲/ ۲۲۹، تاتارخانية ۳/ ۴۴۵، طحطاوى ۳۸۴، الفتاوى الهندية ۱/ ۲۱۳)

ويخرج للوضوء والاغتسال فرضاً كان أو نفلاً۔ (الفتاوى التاتارخانية ۳/ ۴۴۶)

مدرسہ تعلیمی بورڈ میں اصلاحات کی ضرورت

اتر پردیش مدرسہ تعلیمی بورڈ کے امتحانات کا نتیجہ آچکا ہے۔ مدرسہ بورڈ کا نام سن کر یہ خیال آتا ہے کہ اس بورڈ کے امتحانات دینے کی اجازت صرف انہیں طلبہ کو ہوگی جن کا تعلق دینی مدارس سے ہے، لیکن یہاں تو معاملہ اس کے بالکل برعکس نظر آرہا ہے۔ مدرسہ بورڈ کے امتحانات دینے والوں میں اکثریت ان حضرات کی ہے جنہوں نے نہ تو کبھی مدرسہ کا رخ کیا ہے اور نہ ہی ان کو یہ معلوم ہے کہ مدرسہ کے معنی کیا ہیں؟ بلکہ اگر ان سے اردو میں ''مدرسہ'' لکھنے کو کہا جائے تو بہت کم لوگ لکھ سکیں گے۔ ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں قرآن و حدیث، عقائد، علم الکلام اور اسلامی فقہ وغیرہ کے امتحانات کے پرچے تھما دینا نہ صرف سمجھ سے باہر ہے بلکہ دین کے ساتھ کھلا مذاق ہے۔ اکثر حضرات قرآن وحدیث کا غلط ترجمہ اور تفسیر کرتے ہیں، بلکہ بعض مرتبہ ہم نے دیکھا ہے کہ امتحان دینے والا کاپی بھرنے کی ہوس میں قرآن وحدیث کی تفسیر میں اپنے واقعات اور گھر کے حالات اور کسی اخبار وغیرہ کی عبارت اور نہ جانے کیا کیا لکھ دیتا ہے، ظلم پر ظلم یہ کہ ممتحن ان غلط جوابات پر عمدہ نمبرات بھی دیتا ہے؛ بلکہ مشاہدے میں آتا ہے کہ جو جتنا زیادہ غلط سلط لکھ کر کاپی بھر دیتا ہے، اس کے نمبرات خوب عمدہ آتے ہیں۔ لگتا ہے کوئی معیار ہی نہیں ہے۔ پھر یہی حضرات آگے چل کر ''مہتمم'' اور ''ناظم'' کی منھ بھرائی کر کے مدارس میں اردو مدرس بن جاتے ہیں اور طلبہ کے مستقبل کے ساتھ کھلواڑ کرتے ہیں۔ مدرسہ بورڈ کے اراکین اور ذمہ داران کو اس صورت حال کا علم ہونے کے باوجود خاموش تماشائی بنے رہنا سمجھ سے باہر ہے۔ ذمہ داران سے گزارش ہے کہ ان بنیادی خامیوں کا فی الفور تدارک کریں۔

ہزاری روزے کی حقیقت

رجب کی ستائیس تاریخ کے روزے کو بعض لوگ ہزاری روزہ کہتے ہیں اوران کا عقیدہ ہے کہ اس دن روزہ رکھنے سے ہزار روزوں کا ثواب ملتا ہے۔ یاد رکھیں! شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں ہے، اوراس دن روزہ رکھنے کی کوئی خصوصی فضیلت صحیح احادیث میں مروی نہیں ہے۔ اسی لیے حضرت عمر فاروقؓ ستائیسویں رجب کا روزہ رکھنے سے منع فرماتے تھے۔ حضرت خرشة ابن الحر کہتے ہیں: **رأیت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنه یضرب اکف الرجال فی صوم رجب حتی یضعوها فی الطعام ویقول رجب وما رجب انما رجب شهر تعظمه الجاهلیة فلما جاء الاسلام ترک رواه ابن ابی شیبة والطبرانی فی الاوسط** (ماثبت بالسنة ۱۷۳)

البتہ اگر کوئی سنت اور ہزاری روزے کے اعتقاد کے بغیر صرف نفل کی نیت سے روزہ رکھے، تو رکھ سکتا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے ایک کتاب "**تبیین العجب مما ورد فی فضل رجب**" کے نام سے لکھی ہے، جس میں انہوں نے اس ہزاری روزے کو بے بنیاد بتایا ہے، اوراس سلسلے میں جو روایتیں ہیں ان سب پر کلام کیا ہے۔

سماج کی حقیقی تصویر

میں نے بہت سی بے پردہ عورتوں کی آنکھوں میں شرم وحیا دیکھی ہے، اور بہت سی پردہ نشینوں کی نظروں میں آوارگی دیکھی ہے۔ میں نے بہت سے صوفیوں کو نگاہیں اٹھاتے دیکھا ہے، اور بہت سے آوارہ لوگوں کو نظریں جھکاتے دیکھا ہے۔ میں نے بہت سے گناہ گاروں کو مسجدوں میں روتے دیکھا ہے، اور بہت سے داڑھی ٹوپی والوں کو بلا جھجک گناہ کرتے دیکھا ہے۔ میں نے بہت سے فاسق لوگوں کو پنج وقتہ مسجدوں میں سجدہ کرتے دیکھا ہے، اور بہت سے حاجی نمازیوں کو صرف جمعہ اور عید میں آتے دیکھا ہے۔ میں نے بہت سے لٹیروں کو صدقہ خیرات کرتے دیکھا ہے، اور بہت سے مولویوں کو مال کھسوٹتے دیکھا ہے۔ میں نے خانۂ خدا میں بہت سے شرابی کبابی دیکھے ہیں، اور شراب خانوں میں بہت سے اللہ والے دیکھے ہیں۔ میں نے بہت سے دنیا داروں کو بڑا نرم دل پایا ہے، اور بہت سے تہجد گزاروں کو بڑا سخت دل دیکھا ہے۔ میں نے فحش لباس میں بہت سے خدا ترس دیکھے ہیں، اور جبوں قبوں میں بہت سے شیطان کے چیلے دیکھے ہیں۔ کون اچھا ہے؟ کون برا ہے؟ یہ میں اور آپ نہیں جانتے، صرف اللہ جانتا ہے، ٹھیک ہے ظاہر باطن کی عکاسی کرتا ہے، پر کسی کے ظاہر کو دیکھ کر اس کے جنت وجہنم کا فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔

سوشل میڈیا پر گردش کر رہے ایک جعلی فتوے کے متعلق ضروری وضاحت

آج کل ''سوشل میڈیا'' پر جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی پاکستان کے نام سے ایک فتویٰ شائع کیا جارہا ہے، جو سوشل میڈیا پر موضوع بحث بنا ہوا ہے؛ جس میں کہا گیا ہے کہ تبلیغی جماعت کے ارکان کی بیویوں پر شوہر کی غیر موجودگی میں دوسرے مردوں سے تعلقات قائم کرنے کی کوئی ممانعت نہیں ہے، اسلام شوہر اور بیوی کو چار ماہ سے زیادہ ایک دوسرے سے دور رہنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لیے ایسا مرد جو اللہ کی راہ میں چار ماہ سے زائد بغرض تبلیغ یا جہاد گھر سے دور ہو تو اس کی بیوی پر شرعاً کوئی قباحت نہیں کہ وہ غیر مرد سے عارضی تعلقات قائم کرلے، اس صورت میں عورت کو کوئی گناہ نہیں ہوگا اور نہ ہی عارضی تعلقات قائم کرنے کے لیے نکاح کی کوئی قید ہے۔

اس فتوے کو لے کر سوشل میڈیا پر کافی ہنگامہ ہے اور افسوس کی بات یہ ہے کہ کچھ ہندی اخبارات نے بھی اس کو شائع کیا ہے اور ایک پروپیگنڈا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ واضح رہے کہ یہ فتویٰ اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے اور جامعہ بنوریہ سے اس طرح کا کوئی فتویٰ شائع نہیں ہوا ہے۔ یہ کسی بدبخت

کا دجل، مکر وفریب اور تخریب کاری ہے، جو جامعہ بنوریہ کا ''لیٹر پیڈ'' اور مفتیان کرام کے دستخط نقل کر کے کی گئی ہے۔ اور ایک سازش کے تحت اس کو شائع کیا جا رہا ہے، تا کہ تبلیغی جماعت اور دارالافتاوں کو بدنام کیا جا سکے۔

لہذا تمام حضرات خصوصاً ''سوشل میڈیا'' پر متحرک وفعال رہنے والے نوجوان فضلاء سے درخواست ہے کہ قبل اس کے کہ یہ فتویٰ ''الیکٹرانک میڈیا'' کے ہاتھ لگے اور وہ اس پر واویلا مچائے، اس جعلی فتوے سے لوگوں کو آگاہ کریں اور دارالافتاؤں کو بدنام کرنے کی اس گہری سازش کو بے نقاب کریں۔ اس سلسلے میں صحیح حکم شرعی بھی ''سوشل میڈیا'' پر شائع کریں، تا کہ یہ فتنہ یہیں دب کر رہ جائے۔ اللہ ہم سب کا حامی وناصر ہو۔

''تیونس'' کی ایک علمی خاتون کا انتقال

دور حاضر کی ایک بہت بڑی علمی خاتون، عابدہ، زاہدہ، مفسرۂ قرآن الدکتورہ ''ھند شبلی'' کا انتقال ہوگیا ہے۔آپ کا تعلق ''تیونس'' سے تھا اور دنیا کی سب سے قدیم یونیورسٹی ''جامعہ زیتونہ'' میں تفسیر اور علوم قرآن کی پروفیسر تھیں۔ ''**التفسير العلمي للقرآن الكريم بين النظريات و التطبيق**'' جیسی کتاب کی مصنفہ تھیں۔ آپ بہت باہمت اور جرأت مند خاتون تھیں، اسلامی حمیت آپ کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ''تیونس'' میں ۱۹۸۱ء میں جب حکومتی اداروں میں حجاب پر پابندی لگی تو اس خاتون آہن نے نہ صرف اس پر عمل کرنے سے انکار کیا، بلکہ تیونس کا روایتی لباس ''السفساری'' پہننا شروع کر دیا جو سر سے پیر تک پورے جسم کو ڈھانپ لیتا ہے، حتی کہ صدر ''بن علی'' کے دور میں بھی ڈنکے کی چوٹ پر یہی لباس پہنتی رہیں۔ بن علی سے پہلے ۱۹۷۵ء میں صدر ''الحبیب بورقیبہ'' کو اسلام اور عورت کے موضوع پر ایک تقریر میں بڑی جرأت کے ساتھ صاف صاف باتیں سنائی تھیں، اس موقع پر اعلیٰ حکومتی عہدیداروں کے ساتھ غیر ملکی سفارت کار بھی موجود تھے؛ اور تقریب میں صدر نے جب ان سے مصافحہ کرنا چاہا تو انہوں نے انکار کر دیا تھا۔ تفسیر اور علوم قرآن ان کا خاص موضوع تھا۔ ڈاکٹر صاحبہ نے تفسیر اور علوم قرآن پر کئی گراں قدر کتابیں تحریر

فرمائی ہیں، جن میں التصریف: **تفسیر القرآن مما اشتهبت اسمائه وتصرفت معانیه** اور **القرائات بافریقة من الفتح الی منتصف القرن الخامس الهجری** شامل ہیں۔ حق تعالیٰ انہیں غریق رحمت فرمائے، بال بال مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

شان رسالت میں ادنی سی بھی گستاخی برداشت نہیں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی نا قابل برداشت تھی، ہے، اور تا قیامت رہے گی؛ ایک ادنی سا مسلمان سب کچھ برداشت کرسکتا ہے مگر شان رسالت میں ذرہ برابر بھی گستاخی برداشت نہیں کرسکتا۔ ناموس رسالت کے بارے میں سب سے زیادہ حساس غیرت الٰہی ہے۔ قرآن کریم نے گستاخان رسول کو سخت لہجے میں جواب دیا ہے، ان پر لعنتیں برسائی ہیں، ان کو ''عذاب الیم'' کی وعیدیں سنائی ہیں؛ ابولہب کے بارے میں سورہ لہب نازل ہوئی، امیہ بن خلف کے بارے میں سورہ ہمزہ، ابی بن خلف کے بارے میں سورہ یس کی کچھ آیتیں، عقبہ بن ابی معیط کے بارے میں سورہ فرقان کی کچھ آیتیں، ولید بن مغیرہ کے بارے میں سورہ زخرف کی کچھ آیتیں اور عاص بن وائل کے بارے میں مکمل سورہ کوثر نازل ہوئی۔ یہ رب ذوالجلال کا توہین رسالت کرنے والوں پر سخت ردعمل ہے۔ اوران سب گستاخان نبوت کا خوفناک انجام بھی تاریخ کا ایک عبرت خیز باب ہے۔ تاریخ میں ایسا کوئی شاتم رسول نہیں ملتا جس کا خوف ناک اور عبرت انگیز انجام دنیا نے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہو۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی شاتم رسول نے شان رسالت میں گستاخی کی ہے مسلمانوں نے اپنی غیرت ایمانی کا ثبوت دیا ہے۔ اوراس فتنے کی سرکوبی کے

لیے جہاد بالقلم، جہاد باللسان اور جہاد بالسیف کا عملی مظاہرہ کیا ہے۔اور آج کی دنیا میں ضرورت پڑنے پر سڑکوں پر اتر آتے ہیں۔

ناموس رسالت کے تحفظ کے لیے تمام مسلمانوں کا یہ موقف رہا ہے کہ گستاخ رسول کو کبھی معاف نہیں کیا جاسکتا ہے، ہاں البتہ اگر وہ توبہ کرلے تو احناف کے نزدیک اس کی توبہ کا اعتبار ہے۔عہد رسول اور عہد صحابہ وتابعین میں ایسے لوگوں کو سزا دی جاتی تھی۔حضرت خالد بن ولید نے ''مالک بن نویرہ'' کو اس لیے قتل کر دیا تھا کہ اس نے گفتگو میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ''صاحبکم'' (تمہارا ساتھی) کہہ کر گستاخی کی تھی۔

شان رسالت میں گستاخی کے واقعات ہر دور میں پیش آتے رہے ہیں اور شاتمان رسول کا انجام بد بھی دنیا اپنی آنکھوں سے دیکھتی رہی ہے۔اسی طرح کا ایک واقعہ حال ہی میں (دسمبر ۲۰۱۵ء) ہندوستان میں پیش آیا ہے۔''ہندو سبھا'' کے کارگزار قومی صدر (جسے کملیش تیواری کے نام سے جانا جاتا ہے) نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی اور نہایت ہی گھناؤنے الفاظ استعمال کیے ہیں۔اس ملعون نے نہ صرف شان اقدس میں گستاخی کی ہے بلکہ تمام مسلمانوں کے دلوں کو ایک عظیم ٹھیس پہنچائی ہے۔آج ہر طرف سے اس کے خلاف آوازیں اٹھ رہی ہیں اور پورا عالم اسلام اپنے دلوں میں چنگاری لیے ہوئے ہے۔مسلمانان ہند نے زبان وقلم کے ذریعے اور سڑکوں پر اتر کر خوب صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے اپنی دینی غیرت وحمیت کا ثبوت دیا ہے اور یہ واضح کر دیا ہے کہ ''ہم سے نہ ہو سکے گا کہ نبی کا جاہ وجلال دے دیں''۔اس صدائے احتجاج پر تمام لوگ مبارک بادی کے مستحق ہیں، خصوصاً دارالعلوم دیوبند

اور دیگر دینی مدارس کے وہ طلبہ جنہوں نے اس سلسلے میں سب سے پہلے قدم اٹھایا، جن کے جذبات قابل سلام ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ ایک ادنی مسلمان بھی تحفظ ناموس رسالت کے لیے احتجاج کرتا ہوا سڑکوں پر دکھائی دیتا ہے، شان رسالت میں گستاخی ایک ایسا حساس مسئلہ ہے جس پر کوئی بھی مسلمان خاموش نہیں رہ سکتا، تا آں کہ شاتم رسول کو سخت سے سخت سزا نہ دے دی جائے۔

حج عشق و دیوانگی کا مظہر ہے

اسلام کے بنیادی ارکان میں سے ایک رکن حج بیت اللہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: **بني الاسلام علی خمس شهادة ان لا اله الا الله و ان محمدا رسول الله و اقام الصلاه و ایتاء الزکوة وصوم رمضان وحج البیت** (سنن الترمذي رقم ۲۶۰۹) اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔ توحید و رسالت کا اقرار، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، رمضان کے روزے رکھنا اور حج ادا کرنا۔

حج کیا ہے؟ ایک متعینہ اور مقررہ وقت پر دیوانوں کی طرح اللہ کے دربار (کعبۃ اللہ) میں حاضر ہونا، گھرانۂ ابراہیمی کی اداؤں اور طور وطریق کی نقل کرکے ان کے مسلک سے اپنی وابستگی کا اظہار کرنا، دین حنیف کے وفادار ہونے کا ثبوت دینا اور اپنی استعداد کے مطابق ابراہیمی جذبات و کیفیات سے سرشار ہونا۔

حج بظاہر اسلام کے ارکان میں سے ایک رکن ہے، مگر اس کے ہر ہر پہلو سے عشق خداوندی اور محبت ایزدی کا اظہار ہوتا ہے؛ اس کی ادائیگی میں وارفتگی، سرور و مستی اور دیوانہ پن ہوتا ہے، جو عشق الٰہی کا مظہر جمیل ہے؛ اس میں مختلف ادائیں اور طور وطریقے اپنا کر مکمل کوشش و محنت یہ ہوتی ہے کہ کسی بھی

طرح محبوب (اللہ) راضی ہوجائے۔ چناں چہ حجاج کرام طرح طرح کی ادائیں اپنے محبوب کے سامنے پیش کرنے کے لیے دنیا کے ہر چہار سو سے دیوانہ وار وادیٔ مقدس، دیار رسول اور مکہ مکرمہ میں حاضر ہوتے ہیں؛ اللہ کے دربار میں اپنی دیوانگی کا اظہار کرتے ہیں۔ سلے ہوئے کپڑوں کے بجائے کفن نما لباس پہن کر، ننگے سر رہ کر، چیخ چیخ کر "**لبیک اللھم لبیک**" پڑھتے ہوئے، بیت اللہ کا چکر لگاتے ہوئے اس کی دیواروں سے لپٹ کر خوب آہ وزاری کرتے ہیں۔ اور جب دیوانگی اپنے شباب پر ہوتی ہے تو اس کا جلوہ کبھی عرفات کے میدان میں، کبھی مزدلفہ کے صحراؤں میں ظاہر ہوتا ہے؛ تو کبھی جمرات پر بار بار کنکریاں مار کر اپنی وارفتگی کے لیے سامان سکون تلاش کرتے ہیں۔ بالآخر بارگاہ ایزدی میں قربانی کر کے گویا اپنی جان کا نذرانہ بھی محبوب کی خدمت میں پیش کر دیتے ہیں۔ یہ سارے اعمال وہی ہیں جو محبت کے دیوانوں سے سرزد ہوتے ہیں۔ یہ سب محبت ودیوانگی بھی ہے اور نقل دیوانہ پن بھی۔ خاندان ابراہیمی اس رسم عاشقی کا بانی ہے، اللہ تعالی کو ان کی یہ ادائیں اتنی پسند آئیں کہ اس نے ان تمام چیزوں کو حج اور عمرہ کے ارکان ومناسک قرار دیا۔ انہیں سب کے مجموعے کا نام گویا حج ہے، جو اسلام کا ایک عظیم بنیادی رکن ہونے کے ساتھ بندے کی جانب سے اپنے محبوب حقیقی سے سچی انسیت ومحبت اور عشق ودیوانگی کا مظہر ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کا صحافتی سفر

محی الدین احمد (ابوالکلام آزاد) ۱۱؍نومبر ۱۸۸۸ء کو مقدس شہر ''مکہ'' میں پیدا ہوئے، آپ کا گھرانہ علمی لیاقت کے لیے کافی مشہور تھا، آپ کے آباؤ اجداد مغل بادشاہوں کے دربار کے کئی اہم منصبوں پر فائز رہے۔ آپ نے بچپن میں والدین کی نگرانی میں تعلیم حاصل کی اور اردو، عربی، فارسی زبانوں پر عبور حاصل کیا؛ علاوہ ازیں تاریخ، فلسفہ، الجبرا، منطق، کیمیا اور اسلامیات جیسے مضامین میں بھی مہارت حاصل کی۔ آپ کو مطالعہ کا شوق جنون کی حد تک تھا، چراغ کی روشنی میں دیر رات تک مطالعہ میں مصروف رہتے تھے۔ اس وسیع مطالعے کی وجہ سے آپ کے خیالات میں جدت، فکر میں وسعت اور معلومات میں گہرائی و گیرائی پیدا ہوئی۔ اللہ تعالی نے آپ کو بیک وقت بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ آپ نے زبان وادب کی ترقی میں بھی اہم کردار ادا کیا اور بیش بہا خدمات انجام دیں۔

آپ نے زبان وادب کے سفر کی ابتدا شعر وشاعری سے کی اور محض بارہ سال کی عمر میں اشعار کہنے لگے۔ کم سنی میں شاعری کا ایک مجلہ ''نیرنگ عالم'' جاری کیا، جو آٹھ مہینے تک شائع ہوا۔ پھر اس کے بعد ''الصباح'' نکال کر چار مہینے تک اس کی اشاعت کی، اور اسی زمانے میں ''خدنگ نظر'' کی ادارت بھی

کی۔شعروشاعری کے بعد آپ نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا اور ۱۹۰۱ء
کے آخری حصے میں آپ کی ادارت میں ''المصباح'' نامی مجلہ ''کلکتہ'' سے جاری
ہوا۔آپ کی ادارت میں شائع ہونے والا یہ پہلا ادبی ماہنامہ تھا،جس کا اداریہ
''عید'' کے عنوان سے تھا، یہ ماہنامہ عید کے دن جاری ہوا تھا۔ پھر ''المصباح''
کے بند ہوجانے کے بعد آپ نے ہفتہ وار ''احسن الاخبار'' کی ادارت کی۔
۱۹۰۲ء میں ماہنامہ ''مخزن لاہور'' میں آپ کا پہلا مضمون ''فن اخبار نویسی'' شائع
ہوا۔ ان کم عمری کی تحریروں سے آپ کی صحافت سے دلچسپی اور فن اخبار نویسی
کے متعلق آپ کی معلومات کا پتہ چلتا ہے۔ ۱۹۰۳ء تک کا زمانہ گویا تجرباتی زمانہ
ہے۔اس زمانے کی تحریرات مختلف موضوعات تاریخ، ادب، سیاست، مذہب،
سائنس اور دیگر علوم سے متعلق تھیں؛ ساتھ ہی مختلف اخبار و رسائل کے مدیر رہ
چکے تھے۔آپ کے مضامین اور تحریریں اتنی مقبول ہوئیں کہ اپریل ۱۹۰۴ء میں
''انجمن حمایت الاسلام لاہور'' کے اراکین نے ۱۹۰۴ء کے سالانہ جلسے میں آپ
کو پروگرام میں شریک ہونے اور خطاب عام کے لیے مدعو کیا۔آپ نے اس
جلسے میں ''تبلیغ اسلام کا طریقۂ کار'' کے عنوان پر پرمغز تقریر کی، جس سے
سامعین نے بخوبی محسوس کیا کہ ایک پختہ، باشعور اور باصلاحیت تحریروں کا
مصنف تقریر کررہا ہے۔ ۱۹۰۵ء میں علامہ شبلی نعمانی نے آپ کو ''ندوہ'' آنے کی
دعوت دی اور ''الندوہ'' کی ادارت میں شرکت کے لیے آمادہ کیا۔آپ نے اسے
قبول کیا اور ادارے میں بحیثیت معاون مدیر آپ کا انتخاب ہوا۔اندازہ لگایئے!
شبلی نعمانی جیسا شخص ایک کم عمر نوجوان کو ''الندوہ'' کی ادارت میں شامل کررہا
ہے! واقعی معمولی بات نہیں تھی، اس میں آپ کے علم وفضل، باشعور انداز تحریر اور

خداداد صلاحیتوں کو کافی دخل ہے۔

اس کے بعد ۱۳؍ جولائی ۱۹۱۲ء میں آپ نے ''الہلال'' شائع کیا، جو ہندوستان میں صحافت کے میدان میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ پہلا رسالہ تھا جس میں تصویروں کی اشاعت ہوئی اور جو کمپیوٹر تحریر شدہ تھا۔ کچھ ہی عرصے میں اس کی اشاعت گیارہ ہزار سے زائد ہوگئی تھی۔ ''الہلال'' کے ذریعہ آپ نے مسلمانوں کی اخلاقی زبوں حالی پر سخت تنقید کی، ملکی سیاست میں مسلمانوں کی قابل نظر انداز مداخلت پر قوم کو آڑے ہاتھوں لیا اور آزادی کی لڑائی میں مسلمانوں سے جہاد کرنے کی درخواست کی۔ اس رسالے کی آتش فشانی، مقبولیت اور اثرات نے برطانوی حکومت کی نیندیں اڑا دیں؛ اور حکومت نے ۱۹۱۴ء میں اس رسالے پر قانونی پابندی لگا دی۔ لیکن اس سے آپ کے حوصلے سرد نہیں ہوئے۔ ''الہلال'' کے بند ہوجانے کے بعد ایک سال کے اندر ہی آپ نے ایک دوسری ''پریس'' قائم کرکے ''الہلال'' ہی کی نہج پر ۱۲؍ نومبر ۱۹۱۵ء کو ''البلاغ'' کلکتہ سے شائع کیا۔ ان دونوں رسالوں کے مقاصد ایک ہی تھے، (دین الٰہی کی تجدید اور اس کے بنیادی اصول امر بالمعروف اور نہی عن المنکر) صرف نام کا فرق تھا۔ لیکن آپ کو ان دونوں رسالوں کی پاداش میں چار سال قید و بند میں گزارنے پڑے۔ ۱۹۲۰ء میں رانچی سے رہا ہوئے اور ۲۳؍ ستمبر ۱۹۲۱ء کو ہفتہ وار ''پیغام'' کی اشاعت کی، لیکن اس کی پاداش میں پھر گرفتار کر لیے گئے۔ اتنی مشقتوں اور مصیبتوں کے باوجود بھی صحافت سے آپ کا تعلق نہیں ٹوٹا اور اقدام، پیغام، الجامعہ (عربی) کے علاوہ الہلال ثانی کا پہلا شمارہ ۱۰؍ جون ۱۹۲۷ء کو دہلی سے شائع کیا۔ جو تقریباً ۹؍ دسمبر ۱۹۲۷ء تک جاری رہا۔

اسی کے ساتھ آپ نے ترجمان القرآن، غبار خاطر، تذکرہ، الحریۃ فی الاسلام، جہاد اور اسلام، اسلام اور نیشنلزم، قرآن کا قانون عروج وزوال، انڈیا ونس فریڈم وغیرہ کتابیں تصنیف فرمائیں۔ علاوہ ازیں بہت سے مقالات و مضامین لکھے، آپ کے مقالات اور خطبات کے سینکڑوں مجموعے چھپ کر منظر عام پر آگئے ہیں۔

آپ کی تحریروں میں ایک پختہ باشعور مصنف اور ایک اچھے صحافی ہونے کی کامل خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ آپ کی صحافتی عظمت کے سب ہی معترف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو ''ابوالکلام'' کے لقب سے نوازا گیا۔ آپ صحیح معنی میں ''ابوالکلام'' تھے۔

شراب اور منشیات کی تباہ کاریاں اور حکومتوں کا دوہرا رویہ

ہر عقل مند شخص جانتا ہے کہ انسانیت کا مدار عقل وفراست پر ہے، عقل ہی انسان کو دیگر جانداروں سے ممتاز کرتی ہے، اسی عقل سے آدمی اچھے اور برے میں تمیز کرتا ہے، نفع ونقصان کا احساس کر کے نفع بخش چیزوں کو اختیار کرتا ہے اور نقصان دہ چیزوں سے اپنے آپ کو بچاتا ہے، بلکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسان کی ساری سرگرمیاں عقل ودانش کے اردگرد ہی گھومتی ہیں، اگر یہ کہا جائے تو بجا ہوگا کہ اگر عقل ہے تو انسان ہے، اور اگر عقل نہیں تو انسان نہیں۔ اور جو چیز عقل کو ہی ضائع کردے اس سے زیادہ تباہ کن چیز کیا ہوسکتی ہے؟ یہ بات بالکل واضح ہے کہ نشہ سے عقل انسانی ماؤف ہوجاتی ہے، آدمی اچھے اور برے میں تمیز کی صلاحیت سے محروم ہوجاتا ہے، حتی کہ پانی اور پیشاب، بیوی اور بہن کے درمیان بھی تمیز نہیں کر پاتا، بسا اوقات گھر اور راستے کے درمیان بھی فرق نہیں کرتا، چناں چہ کتنے ہی نشہ باز سڑکوں پر پڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

اسلام انسانیت کی تذلیل کبھی برداشت نہیں کرتا، اسلام ایک دین فطرت ہے، اسلامی تعلیمات انسانیت کی بقا کی ضامن ہیں، اسلام نے نشہ اور شراب کو ام الخبائث قرار دیا ہے، کیوں کہ جب عقل ٹھکانے ہوگی تب ہی آدمی برائیوں سے بچے گا، اور جب عقل ہی جاتی رہے اور آدمی نشے میں مدہوش ہوجائے تو پھر وہ کوئی بھی غلط کام بآسانی کرسکتا ہے۔

آج معاشرے میں جو گناہ بکثرت پھیل رہے ہیں ان میں شراب نوشی اور منشیات سرفہرست ہیں، نشے نے انسانی معاشرے کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے، لوگ اس کے چند وقتی اور ظاہری فائدے دیکھ کر اس کی طرف لپکے جا رہے ہیں، جب کہ اس کے دائمی اور تباہ کن مفاسد کو بھی بغور دیکھنا چاہیے۔ بدن انسانی پر شراب کے بے شمار نقصانات ہیں۔ شراب رفتہ رفتہ معدے کے فعل کو فاسد کر دیتی ہے، کھانے کی خواہش کم کر دیتی ہے، چہرے کی ہیئت بگاڑ دیتی ہے، پیٹ کو بڑھا دیتی ہے، مجموعی حیثیت سے تمام قوی پر اس کا اتنا اثر پڑتا ہے کہ جو شخص شراب کا عادی ہو چالیس سال کی عمر کے قریب اس کے بدن کی ساخت بوڑھی عورت کی طرح ہو جاتی ہے، وہ جسمانی طاقت وقوت کے اعتبار سے انتہائی کمزور ہو جاتا ہے، جگر اور گردے خراب ہو جاتے ہیں، ''سل'' کی بیماری شراب کا خاص اثر ہے، یورپ کے شہروں میں سل کی کثرت کا بڑا سبب شراب ہی کو بتایا گیا ہے، وہاں کے بعض ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ یورپ میں آدھی اموات سل کے مرض میں ہوتی ہیں۔ عقل پر شراب کا اتنا اثر پڑتا ہے کہ جب تک اس کا نشہ رہتا ہے عقل کام نہیں کرتی، ماہرین اور ڈاکٹروں کی تحقیق ہے کہ نشے کی عادت قوت عاقلہ کو بھی کمزور کر دیتی ہے، جس کا اثر ہوش میں آنے کے بعد بھی رہتا ہے، بعض اوقات جنون تک اس کی نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اطباء اور ڈاکٹروں کا اتفاق ہے کہ شراب نہ جزوِ بدن بنتی ہے اور نہ اس سے خون بنتا ہے کہ جس کی وجہ سے بدن میں طاقت آئے، بلکہ وہ صرف خون میں ہیجان پیدا کرتی ہے، جس سے صرف وقتی طور پر قوت کی زیادتی محسوس ہوتی ہے، لیکن یہی خون کا دفعتاً ہیجان بعض مرتبہ دل کا دورہ کی شکل میں موت کا سبب بن جاتا ہے۔ شراب کے ذریعے وہ رگیں سخت

ہوجاتی ہیں جن کے ذریعے سارے بدن میں روح پہنچتی ہے، جس کی وجہ سے بڑھاپا جلد آتا ہے۔ شراب کا اثر انسان کے حلقوم اور تنفس پر بھی پڑتا ہے، جس کی وجہ سے آواز بھاری ہوجاتی ہے، دائمی کھانسی ہوجاتی ہے۔ شراب کا اثر نسل انسانی پر بھی پڑتا ہے، چناں چہ شرابی کی اولاد کمزور رہتی ہے اور بعض مرتبہ اس کا نتیجہ قطع نسل تک پہنچ جاتا ہے۔ شراب ایک ایسا زہر ہے جس کا اثر تدریجی طور پر ظاہر ہونا شروع ہوتا ہے اور کچھ عرصے کے بعد تمام نقصانات ظاہر ہوجاتے ہیں۔ شراب کا ایک بڑا تمدنی مفسدہ یہ ہے کہ وہ اکثر لڑائی جھگڑے کا سبب بنتی ہے، جس کے نتیجے میں بغض وعداوت اور دشمنی پھیل جاتی ہے۔ ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ مدہوشی کے عالم میں بعض مرتبہ آدمی اپنے پوشیدہ راز بھی بیان کر ڈالتا ہے۔ اسی طرح شرابی ایک کھلونا بن جاتا ہے جس پر لوگ ہنستے ہیں اور اس کو اپنی ٹھوکروں سے روندتے ہیں، اس کا کلام اور اس کی حرکات سب غیر متوازن ہوجاتی ہیں۔ شراب ایسی ام الخبائث ہے جو انسان کو تمام برے کام اور جرائم پر آمادہ کرتی ہے، زنا اور قتل وغیرہ اسی کے نتائج ہیں، یہی وجہ ہے کہ عام شراب خانے زنا اور قتل کے اڈے ہوتے ہیں۔ شراب کے مالی مضرات اور نقصانات بھی بے شمار ہیں، جس کو ہر شخص بخوبی جانتا ہے، کسی بستی میں اگر کوئی شراب خانہ کھل جاتا ہے تو پوری بستی کی دولت کو سمیٹ لیتا ہے۔ الغرض شراب اور منشیات کے بے شمار نقصانات ہیں، جن کا احاطہ دشوار ہے۔ جرمنی کے ایک ڈاکٹر کا یہ مقولہ مشہور ہے کہ: اگر آدھے شراب خانے بند کردیے جائیں تو میں ضمانت لیتا ہوں کہ آدھے شفاخانے اور آدھے جیل خانے بے ضرورت ہوکر بند ہوجائیں گے۔

لیکن افسوس یہ ہے کہ آج انسانیت کی ٹھیکے دار کہی جانے والی قومیں

شراب اور منشیات کو عام کر کے انسانیت کو تار تار کر رہی ہیں۔ آج کے نئے دور میں نشہ کرنا اور شراب پینا کوئی عیب نہیں رہا ہے، بلکہ فیشن بن گیا ہے۔ جگہ جگہ شراب کے اڈے قائم ہیں، ہوٹلوں حتیٰ کہ چائے کی دکانوں پر بھی شرابیں بآسانی دستیاب ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً حکومتوں کی طرف سے نشہ بازی کے خلاف اشتہارات شائع ہوتے رہتے ہیں، منشیات کی تباہ کاریوں کو بیان کیا جاتا ہے اور شراب نوشی پر لگام کسنے کی باتیں کی جاتی ہیں، لیکن دوسری طرف باقاعدہ شراب بیچنے کے ''لائسنس'' جاری ہوتے ہیں، آئے دن نئی نئی دکانیں کارخانے اور فیکٹریاں قائم کی جاتی ہیں، اور شراب پر بھاری ٹیکس وصول کر کے سرکاری خزانے میں جمع کیا جاتا ہے۔

اسلام اس دورخی پالیسی کا قائل نہیں ہے، اسلام برائی کو جڑ سے مٹانے کی بات کرتا ہے، چناں چہ شراب اور منشیات کے بارے میں اسلام کا واضح اور مضبوط موقف ہے کہ شراب ہو یا دیگر نشہ آور چیزیں، سب ممنوع اور حرام ہیں۔ حتی کہ اسلام نے شراب اور منشیات کی خرید و فروخت اور ان کی دکانیں، کارخانے اور فیکٹریاں وغیرہ بنانے کو بھی ممنوع اور قابل تعزیر جرم قرار دیا ہے۔ اسلام اس منافقت کو کبھی برداشت نہیں کرتا کہ ایک طرف باقاعدہ شراب بنانے اور فروخت کرنے کی اجازت ہو اور دوسری طرف شراب کی بوتلوں پر اس کے نقصانات کی صرف تنبیہ لکھ دی جائے، یا اشتہارات جاری کر دیے جائیں۔ اس طریقے سے کبھی شراب اور منشیات کا رواج ختم نہیں ہوسکتا ہے۔ اسی دوہرے رویہ کی وجہ سے دنیا میں نشہ بازوں کی روز بروز کثرت ہوتی جارہی ہے۔ حکومتوں کو اپنا یہ رویہ بدلنا چاہیے، تاکہ معاشرے کو اس قبیح لعنت سے نجات مل سکے۔

آس کی شمع جلائے رکھنا

قارئین کرام! کسی حادثے کا غم دے جانا اور چیز ہے اور مایوس ہوجانا دوسری چیز، غمگین ہونے اور مایوس ہونے میں زمین وآسمان کا فرق ہے، مایوسی کفر ہے، جب کہ ناسازگار سے ناسازگار حالات میں بھی آس کی لوجلائے رکھنا مؤمن کی شان ہی نہیں، بلکہ اس کا جزوِایمان بھی ہے۔

موجودہ وقت میں محلہ اور گاؤں سے اوپر اٹھ کر صوبائی، ملکی اور عالمی سطح پر دنیا کا جونقشہ ہے اور دنیا کی چکی جس طرح چکر لگا رہی ہے، وہ بے بصیرت لوگوں پر بھی واضح ہے؛ کہ اگر کسی نے کلمہ طیبہ ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' کا اقرار کرلیا تو وہ مجرم ہوگیا، ظلم وستم کی چکیوں میں پسا جانا اس کا مقدر بن گیا، عزت اس کے لیے گویا حرام ہوگئی؛ پھر بہانے بنا کر مختلف طرح کے الزامات لگا کر بلا وجہ اور ناحق ان کی جانوں کو ہلاک کیا جاتا ہے، دنیا کے کونے کونے سے شہدائے اسلام کے خون کی بو اور بے قصوروں کی چیخ وپکار کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ نہ جانے کتنے بچے یتیم ہورہے ہیں، کتنی عورتوں کا سہاگ لٹ رہا ہے، کتنے مسلمانوں کوشہید کیا جارہا ہے، مزید برآں پیغمبر اسلام کی ذات اقدس کونشانہ بنایا جارہا ہے، آپ کی ذات پر حملے کیے جارہے ہیں۔ غرض جس طرف دیکھیے! اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت وتعصب کا بازار گرم ہے۔

ایسے حالات میں اگر نوحہ لکھا جائے، اگر مرثیہ پڑھا جائے، اظہار غم کیا جائے، بے ہوشوں کو جگایا جائے، جاگے ہوؤں کو دوڑایا جائے، درد کا دیا جلایا جائے، احساس کی متاع لٹائی جائے، تو اسے بھی ایک کام اور ایک فریضے کا اتمام کہا جا سکتا ہے؛ تاہم غم نہ کیا جائے، مایوس نہ ہوا جائے، بلکہ ان حالات سے نمٹنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب پیغمبر کی زندگیوں کو سامنے رکھا جائے، دنیا کی ظاہری چمک دمک اور اس کی لذتوں کو چھوڑ کر خالق و مالک کی طرف رجوع کیا جائے، اور اپنے گناہوں سے توبہ واستغفار کیا جائے۔ اور یہ سمجھا جائے کہ بس کچھ عرصے کے لیے اندھیروں کا راج ہے، عنقریب اجالا ہونے کو ہے؛ ظلمتوں کا دور ہے، نور کی برسات ہونے کو ہے؛ فتنوں کی شام ہے، سحر ہونے کو ہے۔

طول غم حیات سے گھبرا نہ اے جگر
ایسی بھی کوئی شام ہے جس کی سحر نہ ہو

شروع اللہ کے نام سے...

کافی دنوں کی آرزو اور تمنا پوری ہوئی اور ماہنامہ ''الفضل'' کا امسال (۱۴۳۶ھ) کا پہلا شمارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے، یہ یقینا پروردگار کی طرف سے بڑے کام کی توفیق ہے۔ ابن ماجہ شریف صفحہ نمبر ۱۳۶ پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ہے کہ: جس اہم کام کو اللہ کا نام لے کر شروع نہ کیا جائے تو وہ ناقص رہتا ہے۔ اللہ پاک نے پہلی وحی میں جہالت کو مٹانے کی تعلیم (اقرأ باسم) اپنے نام سے دی ہے، اللہ کے رسول اپنا ہر چھوٹا بڑا کام اللہ کے پاک نام سے شروع فرماتے تھے، کاموں کی شروعات بسم اللہ سے کرنا امت کے نیک حضرات کا طریقہ بھی رہا ہے، اس لیے اللہ کے نام سے اس سال (۱۴۳۶ھ) کا صحافت کا یہ سلسلہ شروع کرتے ہیں۔ ان شاء اللہ یہ طاقتور، عظیم اور تمام امور میں کفایت کرنے والا نام ہمارے لیے کافی ہوگا۔

صحافت اور اس کی ضرورت

صحافت ایک معیاری فن ہے: صحافت ایک ترقی پذیر، قابل قدر اور معیاری فن ہے، جو بے پناہ قربانیوں کا طالب ہے۔ اس کی اصل روح معاصر دنیا کی ترجمانی، ماحول کی عکاسی اور مختلف انداز فکر کی تجزیہ نگاری ہے۔ ایک

صحافی اور قلم کار کی سحر نگاری اسی وقت مؤثر ہو سکتی ہے جب کہ اس کا قلم اس کے اخلاص پر مبنی جذبات کا ترجمان ہو، جذبۂ باطنی اور قلم کی روانی میں یکسانیت ہو؛ ایسے شخص کی تحریر انقلابی ہوا کرتی ہے اور زمانے میں ایک ٹھوس اور صالح انقلاب کا ذریعہ بنتی ہے۔

صحافت کی ضرورت ہر زمانے میں رہی ہے: کتاب وسنت، تاریخ وسیر اور شمائل وسوانح کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ صحافت نے ہر زمانے میں احقاق حق اور ابطال باطل کا انجام دیا ہے، ہر زمانے میں تغیر و انقلاب پیدا کیا ہے۔ یہ ایسا ہتھیار ہے جس کے ذریعے بگڑے ہوئے ماحول کو سنوارا جا سکتا ہے۔ اسی لیے صحافت کی ضرورت ہر زمانے میں رہی ہے۔

دور حاضر میں صحافت کی ضرورت کچھ زیادہ ہی ہے: دور حاضر فتنوں کا دور ہے، نئے نئے فتنے جنم لے رہے ہیں، انسان نئی آزمائشوں سے گزر رہے ہیں، ''الیکٹرانک'' اور'' پرنٹ میڈیا'' کا دور دورہ ہے، نیز اپنی بات خواص وعوام میں منوانے کے لیے تحریری ثبوت از حد ضروری ہے، ایسے حالات میں ایک صحافی اور قلم کار کی اہمیت بڑھ جاتی ہے، وہ ایسے ماحول میں بڑا اچھا کردار ادا کر سکتا ہے، اس لیے صحافت موجودہ زمانے کی خاص ضرورت ہے۔

دیواری رسالہ ماہنامہ ''الفضل'' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، جو ''انجمن اعزاز البیان طلبۂ ضلع امروہہ دارالعلوم دیو بند'' کے زیر اہتمام ہے، اس دیواری پرچے کا افتتاح ۱۴۲۰ھ میں ہوا تھا، اور اللہ کے فضل وتوفیق سے اس وقت سے لے کر آج تک مسلسل جاری ہے، جس کی ادارت کا بوجھ اس سال (۱۴۳۶ھ) راقم سطور کے کاندھوں پر ہے۔ بارگاہ ایزدی میں دعا ہے کہ وہ اس

سلسلے کو ہمیشہ قائم و دائم رکھے، اور اس سے وابستہ تمام ہی قلم کاروں کو خوف ترقیات سے نوازے۔

هم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

(دارالعلوم دیوبند سے جدائیگی پر)

دل کے احساسات حقیقت کے آئینے میں

ایک دن وہ بھی تھا جب کہ ہم دور تھے　　شوق دیدار سے تیرے معمور تھے
اپنی قسمت پہ نازاں تھے مسرور تھے　　تیرا دیدار ہو بس یہی تھی دعا

اللہ تعالی کے فضل وکرم اوراس کی توفیق سے جب سرزمین ''دیوبند'' آنا ہوااور''دارالعلوم''میں قدم رکھا،تو دیکھ کرآنکھیں خیرہ اوردل حیران رہ گیا۔ایسی پرشکوہ عمارتیں کہ قوت خیالیہ بھی جس کی منظرکشی سے عاجز ہےاورایساعلمی ونورانی ماحول کہ جس کو بیان کرنے کے لیےلغت بھی اپنی تہی دامنی کااعتراف کرتے نظر آتی ہے۔اس پرکیف منظرکودیکھ کربے ساختہ زبان پرآیا کہ الٰہی !اس حقیر وفقیرکو بھی ان خوش قسمت اور سعادت مند لوگوں کی صف میں کھڑا کر دیجیے جو اس درسگاہ سے اپنی علمی تشنگی بجھا کر چلے گئے۔اورجنھوں نے اس کے زیرسایہ رہ کر اپنے وجودکوعلم واخلاق،دیانت وسیاست،جلوت وخلوت اورظاہروباطن کا جامع بنایا۔خدائی کرم نوائی کہ یہ امید برآئی اوراس درسگاہ سےفیض یابی اور یہاں کے علمی وتربیتی ماحول سے استفادے کا موقع ملا۔یہ تعلیمی ادارہ ہمارے لیےنعمت بے کراں اورسرمایۂ افتخار ہے۔لیکن ابھی مکمل سیرابی حاصل نہیں کر سکے تھے کہ وقت جدائی آپہنچا۔باربارزبان پریہ شعرآرہاہے:

ایک مدت تلک دور تجھ سے رہے　　پھر جو قسمت کھلی آ کے تجھ سے ملے
گل کی شاخوں پہ تیری پلے اور بڑھے　　اور جاتے ہیں اب ہو کے تجھ سے جدا

آج جب ہم اپنا تعلیمی سفر پورا کر کے اس علمی آماجگاہ سے کوچ کرنے والے ہیں، تو ہمارا دل خوشی و مسرت اور حزن وغم کا ملا جلا سنگم ہے۔ اگر ایک طرف ہمیں اس بات پر افسوس ہے کہ اس ادارے نے ہمیں جن جملہ علوم وفنون کو مختلف الالوان پھولوں کا گلدستہ بنا کر ایک جامع انداز میں پیش کیا تھا، ہم اپنی نااہلی اور قوت شامہ کی کمزوری کی وجہ سے ان پھولوں کی خوشبو سے مکمل معطر نہ ہو سکے، تو دوسری طرف خوشی اور فرحت وانبساط کی کیفیت سے بھی سرشار ہیں؛ کیوں کہ مے کدے کا محروم بھی محروم نہیں ہوتا۔ اگر ہمیں اس بات پر افسوس ہے کہ ہم اپنے اوقات مکمل طور پر کامیاب نہ بنا سکے تو ہمیں اس بات پر خوشی بھی ہے کہ یہاں کے نورانی ماحول کی برکت ہی ہمارے لیے کافی ہے، جو زندگی بھر ہم کو سرسبز وشاداب رکھے گی۔ ان شاء اللہ

آج دار العلوم ہمیں یہ پیغام دیتا ہے کہ جس دین متین کی حفاظت اور تبلیغ واشاعت کا فریضہ یہ ادارہ انجام دے رہا ہے، ہم بھی اس کے ساتھ اس فریضے میں شامل ہو جائیں۔ ورنہ انگلی کٹا کر شہیدوں میں نام لکھانے اور اس کی طرف اپنی نسبت کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہاں البتہ ہماری احسان فراموشی دوبالا ہو سکتی ہے۔

(دارالعلوم دیوبند سے جدائی پر)

نوائے دل شکستہ

آہ... کتنا سہانا، خوبصورت اور یادگار وقت تھا، جب میں نے اپنے وطن قصبہ ''اوجھاری'' سے علمی زندگی کے سفر کا آغاز کیا تھا؛ کتنی امیدیں میرے سینے میں پنہاں تھیں، کتنے عزائم اور حوصلے قلب وجگر کو جھنجھوڑ رہے تھے، کتنے لوگوں کی دعاؤں کے سہارے میں دامن علم نبوی سے آراستہ ہورہا تھا؛ پھر شوق نے مزید انگڑائی لی اور اللہ تعالی کے فضل وکرم اوراس کی توفیق سے علم کی چاہت اور طلب نے مادر علمی دارالعلوم دیوبند سے ناطہ جوڑ دیا۔

ہم یہاں آئے، ہمارے اندر علم کی تشنگی تھی، نہ مٹنے والی پیاس تھی، ہم یہاں آکر سیراب ہوتے رہے؛ اخلاق سے عاری تھے، اخلاقی قدروں سے مالا مال ہوتے رہے؛ تشنہ محبت تھے، عشق خداوندی اور محبت رسول کے جام پر جام لٹاتے رہے؛ مسرتوں کے متلاشی تھے، یہاں آکر شاد کام ہوتے رہے؛ الغرض اس گلستاں میں خوب چہچہاتے رہے، یہاں کے انوار وبرکات کے خزینے سے اپنا دامن بھرتے رہے، اس گلہائے رنگا رنگ کی خوشبوؤں سے ذہن وفکر کو معطر کرتے رہے، یہاں کے باغ وبہار پر کیف لیل ونہار اور دینی وعلمی ماحول میں خوب پھولتے پھلتے رہے، کہ اچانک وقت جدائی آپہنچا... آج آنکھ اشکبار ہے، دل غمگین ہے، زبان گنگ ہے، زبان حال پر یہ شعر جاری ہے:

ذکرفرقت سےمت کرحراساں مجھے   میری قسمت پہ یاراں پشیماں مجھے
ساقیا توڑ مت نہ کر پریشان مجھے   آہ... بتلاؤں کیا دل پہ بیتے ہے کیا

میں اس غم ہجراں سے نڈھال اور فرقت کی اس مضطرب کیفیت میں مادرعلمی کے روبرو اس کے حسین چہرے پر اپنی پرشوق نظریں جمائے ہوئے سراپاالتجا بن کرصدالگارہاہوں کہ:

''اے مادرعلمی! تو نے میری عمدہ پرورش کرکے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا حوصلہ بخشا، بہترین تعلیم وتربیت سے آراستہ کرکے جینے کا سلیقہ عطا کیا،توحید باری تعالی اورعشق نبوی کے گیت سنائے، بادسموم سےٹکرانے کی جرأت وہمت عطا کی؛ پھرآج اتنی بے رخی کیوں؟ برسوں سے مجھ سے آباد تیری گودآج میرے لیےتنگ کیوں ہے؟ تو ہی بتا تیری شفقت ومحبت کہاں مل پائے گی؟ بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ میری خطاؤں کو معاف کرنا،لغزشوں کو درگزرکرنا۔ میں تیری محبت کا صلہ دینے کی ہرممکن کوشش کروں گا، تیرا پیغام دنیا کے ہرکونے تک پہنچانے کی کوشش کروں گا، تیرے دیے ہوئے درس و پیغام کو اہل دنیا کے سامنے عیاں کروں گا، انہیں اسلامی تعلیمات سے روشناس کراؤں گا۔ اپنی حیات مستعار کے آخری سانس تک تیرے مشن، تیرے مسلک، تیرے اعتدال، تیرے مزاج اور تیرے تصوف وسلوک کو روح میں بسا کر دنیا کے سامنے تیرانام روشن کروں گا۔ان شاءاللہ۔خدا تیرا سایہ ہمیشہ باقی رکھے، تیری محبت اورالفتیں ہمیشہ ملتی رہیں۔

اب گھڑی ہے جدائی کی سر پہ کھڑی   دل نہ تھرائے کیوں جان لیوا گھڑی
ٹل نہ جاتی ہے کیوں یہ گھڑی دوگھڑی   یا مجھے موت آئے یہیں اے خدا

(دارالعلوم دیوبند سے جدائی کے موقع پر)

اے گلشن قاسم! ہم تیری جدائی کو جدائی نہیں سمجھتے

جہاں ایسا ماحول ہو کہ ایک چمنستان ہو، اس میں رنگہا رنگ کے درخت اور پھول پتیاں ہوں، سرسبز وشاداب گھاس ہو، خوش گوار فضا ہو، آب و ہوا ایسی مشک بار ہو کہ جس سے ٹہنیاں کلیاں اور پھل پتیاں سرسبز وشاداب ہو کر لطف اندوز ہوتے ہوں، وہاں سے گزرنے والی تتلیاں بھی اس موسم بہار سے مسحور ہوجاتی ہوں؛ اس چمن کی کیا روداد سنائی جائے؟ اس کو کیسے الفاظ میں ڈھالا جائے؟ ایسے چمنستان سے فیض یاب ہونے والا اور ایسی پر کیف فضا میں اپنی زندگی کے روز وشب بسر کرنے والا مجنوں جب یہاں سے جدا ہوگا تو اس کی کیا کیفیت ہوگی؟ دل پر کیا گزر رہی ہوگی؟

کچھ ایسی ہی کیفیت کے آج ہم شکار ہیں، آنکھیں اشک بار ہیں، جگر پارہ پارہ اور دل شکستہ ہے، ہر زندہ دل حال سے بے حال ہے، ایک دوسرے سے معلوم کرنے کی سکت تک نہیں ہے، ہر دل وزبان سے آہ آہ کی صدائیں نکل رہی ہیں، ایسا محسوس ہورہا ہے کہ ہم پر رنج والم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں۔

اس مادر علمی کی ممتا یہاں آنے سے پہلے ایسی تھی جس کا اندازہ لگانا ذہن وعقل کی فکر کے زاویے سے بھی بالاتر ہے، جس کو بیان کرنے کے لیے الفاظ کا

ذخیرہ کہاں سے لائیں؟ لیکن آہ... یہ کیسا وقت آ گیا ہے کہ آج اس گلستاں کی سیرابی کو ترسنے والے ہزارہا ہزار چہچہاتی بلبلوں کا جم غفیر ہے، نفسا نفسی کا عالم ہے، کوئی پرسان حال نہیں ہے، اک قیامت سی برپا ہے۔

ذرا سوچو! پروانوں کو چن کر باغ و بہار میں لایا جائے، اس وقت ان کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟ پھر ان کو اس سے جدا کر دیا جائے، اس موقع پر کیا کیفیت ہوتی ہے؟ اس کو الفاظ کے پیرائے میں ڈھالا نہیں جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اے گلشن قاسم! ہم تیری جدائی کو جدائی نہیں سمجھتے، بلکہ تیری وقعت و محبت جدائی کے بعد کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے؛ تو ہمارے ذہنوں اور رگوں میں دم سیال کی طرح رہے گا، تو ہماری زبانوں پر نغموں کی طرح رہے گا، تو ہماری آنکھوں کے سامنے ایک حسین سنگم کی شکل میں رہے گا۔

کون کہتا ہے شب ہجر ہے تنہا عشق
یاد اس بت کی انیس شب تنہائی ہے

ہم تیرے لیے بارگاہ ایزدی میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے ہیں کہ:

اے خدا ایں جامعہ دائم بدار
فیض او جاری بود لیل و نہار

دارالعلوم دیوبند میں تعلیمی سال (عربی ششم) کی تکمیل پر

آخری بات

دنیا کا سارا کام کسی نہ کسی مقصد کے تحت ہوتا ہے، کام کرنے والوں کی نگاہیں اس پر مسلسل جمی رہتی ہیں، اس کے حصول میں درپیش مصائب ومشکلات کو سہنے اور اس راستے کے سارے خاروں کو پھول سمجھ کر خوشی سے قبول کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ جس آدمی میں اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی بیداری، جذبہ اور ہمت زیادہ ہوتی ہے، وہ بامراد بھی سب سے زیادہ ہوتا ہے؛ کیوں کہ وہ کام میں محنت سے لگتا ہے، اگلے کام کا خاکہ اور منصوبہ تیار کرتا ہے اور نفع اور نقصان کا حساب بھی لگاتا ہے۔ یہ تینوں کام اس کے مستقبل کے لیے راہیں کھولتے ہیں۔ پھر وہ انسان ایک نئی توانائی عزم اور حوصلے کے ساتھ اگلی کوشش کرتا ہے، اگر پیچھے کچھ کمی رہ گئی ہے تو اس کی تلافی کرتا ہے اور اگلے کو پچھلے سے بہتر اور اچھا بنانے کی انتھک کوشش میں لگ جاتا ہے۔ بالآخر چند دنوں کے بعد وہ فضل وکمال کا درخشندہ ستارہ بن کر طلوع ہوجاتا ہے۔ مگر جو اس سے عاری اور خالی ہوتے ہیں ان کا ہر اگلا دن پچھلے دن سے زیادہ خراب اور تنزلی کی راہ لیتا جاتا ہے، اور تھوڑے ہی دنوں میں وہ نامراد اور ناکام ہوجاتے ہیں۔

مدارس اسلامیہ کا بھی ایک مقصد ہے، بلکہ عظیم مقصد ہے، جس کے لیے ان کی تاسیس عمل میں آئی ہے؛ وہ مقصد طالبین میں استعداد علم، استعداد تبلیغ اور تہذیب اخلاق پیدا کرنا ہے۔ اگر کوئی مدرسہ، استاد اور طالب علم اس مقصد کو ایک حد تک پورا کرنے والا ہے، تو مقصد تاسیس حاصل ہے، ورنہ اس گروہ پر لازم ہے کہ اپنے شب و روز پر نظر ثانی کریں، اپنے مقصد کو سامنے رکھیں اور دنیا و آخرت کی دوڑ میں سبقت لے جانے کی کوشش کریں۔

عزیز ساتھیو! تعلیمی سال شروع ہوا، ہم یہاں مادر علمی ''دارالعلوم دیوبند'' میں حاضر ہوئے اور اجمالا یہی تین باتیں سامنے رکھ کر داخل ہوئے۔ سال پورا ہوگیا، اب چل چلاؤ ہے، اپنے چلنے سے پہلے ہم لوگ اپنے سال کا محاسبہ کریں کہ ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا؟ کتنا ہمیں ان تینوں امور میں آگے بڑھنا تھا اور کتنا ہم منزل سے قریب ہوئے؟ اگر ہم ایک حد تک کامیاب نظر آتے ہیں تو اللہ تعالی اور اپنے اساتذہ کا شکر ادا کریں، اور اگر ناکام نظر آتے ہیں تو اپنے شب و روز پر ضرور نظر ثانی کریں، ورنہ فضائے عالم ہم پر ماتم کناں ہوگی اور نتیجہ یہ ہوگا کہ:

اٹھا میں مدرسہ اور خانقاہ سے غم ناک — نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

بس یہ آخری بات پیش کرنی تھی، جو ذہن و دماغ میں بار بار گردش کر رہی تھی۔ دوسری طرف کچھ ساتھیوں کی جدائی بھی ہے، جس پر قلب و جگر مضطرب ہے، زبان حال پر یہ شعر جاری ہے:

بھول جاتی ہیں خوشیاں جنہیں انہیں غم یاد رکھتے ہیں

ملتے ہیں جو زندگی میں انہیں ہم یاد رکھتے ہیں

کچھ کہانیاں زندگی کے سفر میں ایسی بھی ہوتی ہیں
مٹا دیتے ہیں جنہیں کاغذ انہیں قلم یاد رکھتے ہیں

آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالی ہم سب کو ترقیات سے نوازے، مقصد میں کامیابی عطا فرمائے اور ہمارے مستقبل کو خوب روشن و تابناک بنائے۔

سحر افشاں کو نئی زندگی مبارک ہو!

فلمی دنیا سے توبہ کرنے والی اداکاراؤں کا سلسلہ جاری ہے، پچھلے دنوں ''زائرہ وسیم'' اور ''ثنا خان'' نے اس غلاظت بھری دنیا سے توبہ کی تھی، اب خبر ہے کہ مشہور اداکارہ ''سحر افشاں'' نے فلمی دنیا کو خیر آباد کہہ دیا ہے۔ انہوں نے سماجی رابطوں کی ویب سائٹ پر ایک پیغام جاری کیا ہے، جس میں انہوں نے فلمی صنعت کو چھوڑ کر سابقہ زندگی سے توبہ کرتے ہوئے باقی زندگی مذہب اسلام کے مطابق گزارنے کا عزم ظاہر کیا ہے۔

سحر افشاں کا تعلق بنگلور کرناٹک سے ہے، ان کی پیدائش ۱۹۹۴ء میں ہوئی، اس کم عمری میں انہوں نے فلمی دنیا میں خوب شہرت حاصل کی۔ تیلگو اور بھوجپوری فلموں میں انہوں نے کام کیا اور ''بھوجپوری انڈسٹری'' کی مشہور و ممتاز اداکارہ قرار پائیں۔ اس میدان میں ان کے لیے شہرت و دولت کے ساتھ بہت راستے کھل گئے، لیکن جلد ہی انہیں احساس ہو گیا کہ یہ سب راستے تباہ کن ہیں اور دنیا و آخرت کو برباد کرنے والے ہیں۔ چناں چہ انہوں نے اپنی آخرت کی خاطر فلمی صنعت کو چھوڑ دیا۔ انہوں نے اپنے پیغام میں لکھا ہے کہ:

''میں آپ سب کو مطلع کرنا چاہتی ہوں کہ میں نے یہ طے کیا ہے کہ میں شوبز (فلم انڈسٹری) کو چھوڑنے جا رہی ہوں، اور اب اس سے میرا کوئی تعلق

نہیں ہوگا۔اوران شاء اللہ میں اگلی زندگی اسلامی تعلیمات اور اللہ کے احکام کے مطابق گزارنے کا ارادہ رکھتی ہوں،اوراپنی گزشتہ زندگی سے توبہ کرتی ہوں،اور اللہ سے توبہ کرتی ہوں اور اللہ سے معافی کی طلب گار ہوں۔ اگرچہ مجھے بہت زیادہ شہرت اور دولت بھی ملی لیکن ہمیشہ ایک خلش میں بھی مبتلا رہی، کیوں کہ اس زندگی کا میں نے بچپن میں بھی تصور نہیں کیا تھا،بس اتفاق سے ہی اس انڈسٹری میں آئی اور آگے ہی بڑھتی گئی،لیکن اب یہ سب ختم کرنے کا ارادہ کرلیا ہے،اور اگلی زندگی ان شاء اللہ اللہ کے حکم کے مطابق گزارنے کا ارادہ ہے۔آپ سب سے دعا کی درخواست ہے کہ اللہ مجھے استقامت اور نیکی والی زندگی عطا فرمائے۔امید کرتی ہوں کہ مجھے میری پچھلی زندگی سے نہیں بلکہ آنے والی زندگی سے یادرکھا جائے گا''۔

سحر افشاں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اور جو عزائم کیے ہیں،ان میں انہیں استقامت نصیب ہو۔ یہاں سے ان کی نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ ان کو نئی زندگی مبارک ہو۔ بڑی خوش نصیبی کی بات ہے کہ آدمی دولت،شہرت اور دنیا کی چکاچوند کو چھوڑ کر اپنے آپ کو خدا کے احکام کا پابند بنالے۔اگر کوئی بندہ یا بندی اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اس پر اللہ کی خاص نظر کرم ہوتی ہے۔اللہ کی رحمتوں کا سمندر تو اتنا وسیع ہے کہ بڑے سے بڑے گناہ گاروں کو بھی معاف کردیتا ہے،بس بندہ سچے دل سے توبہ کرے اور ندامت کے آنسو بہاتے ہوئے معافی کا طلب گار ہو۔ یقیناً عقل والے فلاح پاتے ہیں اور دنیا وآخرت میں کامیابیاں ان کا مقدر بن جاتی ہیں۔

نئی نسل کے لیے اس میں یہ پیغام پوشیدہ ہے کہ وہ عبرت ونصیحت

حاصل کریں اور فلمی دنیا کی غلاظتوں سے اپنے آپ کو بچائیں۔ یاد رکھیں کہ: عزت، دولت اور شہرت حرام اور ناجائز راستے اختیار کرنے سے نہیں بلکہ اللہ کا محبوب و مقرب بندہ بننے سے حاصل ہوتی ہے۔ اللہ ہم سب کے گناہوں کو معاف فرمائے۔

تفسیروں میں اسرائیلی روایات کیسے مخلوط ہوئیں؟

قرآن کریم کی تفسیروں میں بہت سے واقعات اور قصے خلاف فطرت، خلاف عقل اور خلاف تجزیہ ومشاہدہ ہیں؛ جن کو اسلامی اصطلاح میں اسرائیلی روایت یا اسرائیلیات کہا جاتا ہے۔ یہ روایتیں دراصل اسلامی روایتیں نہیں بلکہ ان کا منبع ومخرج یہودی قوم ہے۔ اسی طرح وہ واقعات اور قصے جن کی بنیاد یہودیت تونہیں البتہ ان روایتوں کو وضع کرنے والے منافقین یا مشرکین یا نصاریٰ ہیں تو ان واقعات اور قصوں کو بھی اسرائیلیات کہا جاتا ہے، یعنی اسرائیلیات کا لفظ اب وسیع مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔

اسلامی تاریخ بتاتی ہے کہ اسلام اور پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے سب سے زیادہ بغض وکینہ یہودیوں کے دلوں میں تھا، انہوں نے چاہا کہ کسی طرح قرآن کی صداقت وحقانیت کو داغ دار کیا جائے، لیکن ان کے لیے یہ ممکن نہیں تھا، کیوں کہ ارشاد خداوندی ہے: **انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون** (سورۃ الحجر ۹) کہ ہم نے قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ البتہ انہوں نے ایک سازش کی کہ قرآن میں جو قصے اور واقعات مختصرا بیان کیے گئے ہیں ان کی تفصیلات میں جھوٹے قصے، مہمل باتیں، خلاف عقل ومشاہدہ اور محیر العقول کہانیاں گھڑ کر مسلمانوں میں پھیلا دیں؛

تا کہ قرآن میں بیان کردہ مجمل واقعات کے ذکر کے وقت یہ تفصیلات بھی قرآن سے جوڑ دی جائیں، اس طرح قرآن کی بے داغ صداقت وحقانیت بڑی آسانی سے داغ دار ہوسکتی ہے؛ چناں چہ پھر یہی ہوا اور اسرائیلی روایات اسلامی روایات میں مخلوط ہوگئیں، نتیجتاً ان کے درمیان حد فاصل کھینچنا مشکل ہوگیا۔

اس کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ مسلمان اپنے ذوق تجسس اور جذبۂ دینی کی وجہ سے اہل کتاب مسلمان علماء سے ان واقعات اور قصوں کی تفصیل معلوم کرنے کے خواہاں رہتے تھے، جن کو قرآن کریم نے اجمالاً بیان کیا ہے؛ ان مسلمان اہل کتاب علماء کو یہودی مذہب کی جو روایتیں معلوم ہوتی تھیں وہ بیان کردیا کرتے تھے، مسلمانوں میں یہ روایتیں عام ہوتی اور ایک دوسرے سے بیان بھی کی جاتی تھیں، البتہ ان کے بیان کا مقصد اسلامی شریعت میں کوئی استدلال نہیں تھا۔ پھر یہ روایتیں مسلمانوں میں اتنی زیادہ عام ہوئیں کہ تفسیر کی کتابوں میں بھی شامل ہوگئیں۔ اس کے بعد چھٹی اور ساتویں صدی میں ان روایتوں کو اسلامی عقائد واصول کی کسوٹی پر باقاعدہ پرکھا گیا اور کھرے کھوٹے کو جدا کرنے کی کوشش کی گئی۔

جہاں تک بات ہے اسرائیلی روایات کو قبول کرنے اور نہ کرنے کی، تو وہ اسرائیلی روایات جو قرآن وحدیث کی تصدیق کرتی ہیں، وہ مقبول ہیں، ان کا ذکر کرنا جائز ہے اور بطور شہادت بھی ان کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ اور جو معتقدات اسلامی کے خلاف ہیں، وہ غیر مقبول ہیں اور ان کا بیان کرنا بھی جائز نہیں ہے، ہاں تردید کے لیے ان کو بیان کیا جاسکتا ہے۔ اور جو روایتیں سچ اور جھوٹ کا احتمال رکھتی ہیں، ان کے بارے میں توقف کیا جائے گا۔

ایک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

دنیا کی تاریخ میں شاید کوئی ایسی وبائی بیماری آئی ہو، جو پوری دنیا میں پھیلی ہو، لمبے زمانے تک ٹھہری ہو اور بڑی تعداد میں ہلاکتوں کا سبب بنی ہو۔ ''کروناوائرس'' کا نام سنتے ہی ایک خوف سا طاری ہوجاتا ہے،جس نے بے شمار انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ افراتفری اور نفسانفسی کا ماحول اور دن بدن ہلاکتوں کی تعداد دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ شاید اب موت کے چنگل سے کوئی نہیں بچ سکے گا۔ وبائی ہیجان کے اسی دور میں اطلاع ملی کہ سنبھل کے مشہور ومعروف عالم دین، ہم سب کے محسن وکرم فرما حضرت مولانا عبدالمؤمن صاحب شدید بیمار ہیں؛ طبیعت کی نزاکت کے پیش نظر علاج ومعالجے کے لیے سنبھل سے دہلی منتقل کیا گیا ہے۔ سوچا کہ مولانا ان شاء اللہ ضرور ٹھیک اور صحت یاب ہوجائیں گے، ابھی تو انہیں بہت ذمہ داریاں سنبھالنی ہیں، ابھی تو وہ ایک نوخیز پھول کی طرح ہیں جس کی خوشبو مہکنا شروع ہوئی ہے، ابھی تو وہ اس درخت کی طرح ہیں جس کی شاخیں پھوٹنا شروع ہوئی ہیں اور بہت جلد وہ ایک گھنا درخت بن جائے جس سے مخلوق سایہ حاصل کرے، ابھی تو وہ اس چشمے کی طرح ہیں جو ابلنا شروع ہوا ہے اور لوگ اپنے ظرف لے کر اس کی طرف چل پڑے ہیں، ابھی تو وہ اس مالی کی طرح ہیں جس نے گلشن کو سینچنا شروع کیا ہے، اور ابھی تو وہ

اس نئے چراغ کی طرح ہیں جس کی کرنیں چمکنا شروع ہوئی ہیں۔

لیکن یہ سب خیالات خیال بن کر ہی رہ گئے، تدبیریں تقدیر پر غالب نہ آسکیں اور مولانا قضائے الٰہی سے اس دار فانی سے دار بقاء کی طرف رحلت فرما گئے۔ یہ رمضان المبارک کا مقدس ومحترم مہینہ تھا، رمضان ۱۴۴۲ھ کی ۳؍ تاریخ تھی، رحمت کا عشرہ تھا اور جمعہ کا بابرکت دن تھا؛ ایسے مبارک موقع پر آپ کا عالم بالا کا سفر طے ہوا۔ نماز جمعہ کے بعد نماز جنازہ اور تدفین عمل میں آئی۔

آپ کی وفات سے بہت دکھ اور افسوس ہوا، جو کہ فطری ہے۔ یقینا یہ کائنات فنا ہوجائے گی، یہاں کسی بھی چیز کو دوام نہیں ہے، ہر چیز ختم ہوجائے گی، بس ایک اللہ رب العزت کی ذات باقی رہے گی، جو کہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ **کل من علیھا فان و یبقی وجہ ربك ذو الجلال و الاکرام** (سورہ رحمن)۔ دنیا میں جس انسان نے بھی آنکھیں کھولی ہیں ایک نہ ایک دن اسے یہاں سے جانا ہے، بیماری صرف ایک بہانہ ہوتی ہے، موت وحیات کا مالک اللہ رب العالمین کی ذات ہے، موت ایک اٹل حقیقت ہے، پتہ نہیں کس کی زندگی کا سفر کب ختم ہوجائے؟ کہاں ختم ہوجائے؟ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ موت کس پر کب اور کہاں طاری ہوگی۔

مولانا عبد المؤمن صاحب سنبھل کے ایک مشہور ومعروف عالم دین تھے۔ ہندوستان کے مشہور عالم دین حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمہ اللہ کے حقیقی بھائی حکیم محمد احسن صاحب کے یہاں ۱۹۶۳ء میں آپ کی پیدائش ہوئی۔ دار العلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی۔ ذہین وفطین اور ہوشیار وہوش مند طلباء میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد دیگر خدمات کے ساتھ ''مدرسہ

مدینۃ العلم انجمن معاون الاسلام سنبھل'' کی ذمہ داری سنبھالی، اور آپ کی کوششوں سے بہت تیزی کے ساتھ مدرسے کو مادی، تعلیمی وروحانی ترقی نصیب ہوئی۔آپ نے اس مدرسے کو حقیقی معنی میں مدینۃ العلوم بنادیا، جہاں سے بہت سے اہل علم تیار ہوئے۔آپ تاحیات یہیں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ ساتھ ہی دعوتی، تبلیغی اور اصلاحی میدانوں میں بھی سرگرم رہے اور تاحیات مختلف علاقوں کے دعوتی، تعلیمی، تبلیغی اور اصلاحی دورے کرتے رہے۔

آپ کا ایک خاص وصف جس سے اللہ نے آپ کو نوازا تھا، تقریر و خطابت ہے۔فن خطابت گویا آپ کی فطرت میں شامل تھا، ایک بہترین مقرر اور خطیب بلکہ فن خطابت کے شہسوار تھے۔منفرد لب ولہجہ تھا، انداز واسلوب میں روانی تھی، لہجے میں گھن گرج اور آواز میں شیرینی تھی۔فصاحت وبلاغت سے بھرپور، قرآن وحدیث سے مدلل اور حالات زمانہ سے ہم آہنگ خطاب فرماتے تھے۔آپ کا خطاب بڑی دل جمعی سے سنا جاتا تھا۔ملک و بیرون ملک بڑے بڑے مجمعوں سے آپ نے خطاب کیا اور اپنی تقریروں سے سوئی ہوئی امت کو مسلسل بیدار کرتے رہے۔ ہر جمعہ کو آپ ''مدینہ مسجد سنبھل'' میں بھی خطاب فرماتے تھے، شہر اور دور دراز سے لوگ آپ کا خطاب سننے اور آپ کی اقتدا میں نماز جمعہ ادا کرنے کے لیے حاضر ہوتے تھے۔آپ کے بہت سے بیانات انٹرنیٹ پر بھی موجود ہیں۔

اصلاح باطن اور تزکیۂ نفس کے لیے آپ حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی دامت برکاتہم سے بیعت ہوئے، ان سے خصوصی تعلق اور خلافت بھی حاصل ہوئی، جس سے آپ کو ایک نئی روح ملی، روحانی ذوق کا غلبہ ہوا اور

آپ نے بڑے جوش وجذبے سے ایمان کوفروزاں کرنے، تربیتی نظام کوآگے بڑھانے اورتصوف وسلوک سے لوگوں کو جوڑنے کے لیےمختلف مقامات پرذکر کی مجلسیں قائم کیں؛ اورتاحیات اپنے مدرسے کی مسجد میں ذکر کی مجلس سجاتے رہے۔ یہ تصوف وسلوک ہی کی برکت تھی کہ بڑی تعداد میں لوگ آپ سے جڑے،خصوصاً نوجوان آپ سے بہت متأثر ہوئے اور بڑی تعداد میں وابستہ ہوئے۔

سیرت وصورت اورکردار کے اعتبار سے آپ نمایاں صفات کے حامل تھے۔ چہرے پر وجاہت ونورانیت، آواز وگفتار میں حلاوت وشیرینی، لہجے میں شرافت وعمدگی، آنکھوں میں محبت وبصیرت، فطرت میں قناعت، باتوں میں صداقت ودیانت اور مزاج میں نفاست وپاکیزگی اور شگفتگی تھی؛ نشست وبرخاست اورلباس وپوشاک میں خاصے نفاست پسند تھے۔ بود وباش، رہن سہن حتی کہ اشیاء کی خرید وفروخت میں بھی حد درجہ شائستگی کا خیال رکھتے تھے۔ اور جو آپ سے وابستہ ہوجاتا اسے بھی اپنے ہی رنگ وڈھنگ میں ڈھالنے کی پوری کوشش کرتے۔غرض ایک جامع الصفات شخصیت تھے۔

ایسی شخصیت جب دنیا سے چلی جاتی ہے تو ایک عجیب سا سماں بندھ جاتا ہے اور بے چینی کی غیر معمولی صورت حال پیدا ہوجاتی ہے۔یقین ہی نہیں ہوتا ہے کہ مولانا ہمارے درمیان نہیں رہے، ایسا لگتا ہے کہ وہ ابھی بھی ہمارے درمیان موجود ہیں، ان کی محبتیں آج بھی لوگوں کے دلوں کو لبھاتی ہیں اور وہ ہمیشہ دلوں میں زندہ رہیں گے۔

نگاہ دل میں رہیں گے تمام عمر مرے

اتر سکے گا نہ احسان لطف پیہم کا

ملے مقام وہ جنت میں آپ کو اے شیخ

کہ جس میں ہو قرب حاصل رسول اکرم کا

دعا ہے کہ رب العالمین آپ کی بال بال مغفرت فرمائے، درجات بلند فرمائے، اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، پس ماندگان اور وابستگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، امت مسلمہ کو آپ کا نعم البدل عطا فرمائے، اور آپ جس تحریک اور مشن کو چھوڑ کر گئے ہیں اسے آگے بڑھانے کی ہم سب کو توفیق عطا فرمائے۔

مولانا رشید احمد گنگوہی اور رد بدعات وخرافات

ہندوستان میں ایک وقت ایسا آیا کہ مسلمان بے بسی کے عالم میں سلامتی کی راہیں تلاش کررہے تھے، ان کے جاہ وجلال اور عظمت واقتدار کا پرچم ماند پڑ رہا تھا، مئی ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کا آٹھ سو سالہ ایوان اقتدار اتنا دھماکے کے ساتھ گرا کہ پورے ملک میں زلزلہ آ گیا تھا، ہر گھر کی در ودیوار ہل گئی تھی، مذہب اسلام پر خطرات کے بادل منڈلانے لگے تھے، باطل مذاہب سینہ تان کر کھڑے ہو رہے تھے، کسی طرف نیچریت کا غلبہ تھا، تو کسی جانب اعتزال ودہریت کا، کہیں رفض وتشیع کا دور تھا، تو کہیں خروج کا، ایک طرف عدم تقلید پھیل رہی تھی، تو دوسری طرف قرآنیت ومرزائیت کا بیج پڑ رہا تھا، کہیں قبر پرستی وتعزیہ پرستی عروج پر تھی، تو کہیں اولیاء اللہ کی توہین اور بدزبانی ہو رہی تھی؛ غرض معاشرہ افراط وتفریط کا شکار ہو گیا تھا۔ نتیجتاً مسلمان بدعات وخرافات اور مشرکانہ رسم و رواج میں مبتلا ہو گئے تھے۔

تاریخ کے اس نازک موڑ پر ایک شخصیت وجود میں آئی، جو اپنے مضبوط کردار اور حیرت انگیز کارناموں کی وجہ سے تاریخ کا عنوان بن گئی؛ جس نے مسلمانوں کو ذلت وپستی کے غار سے نکال کر اوج ثریا پر لانے کی جد وجہد کی، مسلمانوں کو بدعات وخرافات اور مشرکانہ رسموں سے بچا کر صحیح راہ پر لانے کی کوشش کی، دودھ اور پانی کے امتیاز کو سمجھایا اور پوری زندگی ایسے کارنامے انجام

دیے جن کو بھلایا نہیں جاسکتا۔

مؤرخ کا قلم مجبور ہے کہ جب اسلامی ہند کے عروج وزوال کی تاریخ مرتب کرے، تو اس شخصیت کو ہندوستان میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ، تحریک اصلاح کے میر کارواں اور ملت اسلامیہ کے مسیحا کی حیثیت سے پیش کرے؛ اوراس کے عظیم الشان کارناموں کو سنہرے حرفوں میں لکھے۔ یہ وہ ذات ہے جس نے ضلع ''سہارنپور'' کے قصبہ ''گنگوہ'' میں جلوہ افزائی فرمائی۔ یعنی قطب عالم، مرشد برحق، امام ربانی، حضرت مولانا رشید احمد صاحب محدث گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ۔

حضرت گنگوہی قدس سرہٗ نے ۶/ ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ دوشنبہ چاشت کے وقت اس گہوارۂ عالم فانی میں قدم رکھا۔ آپ کا مولد ومنشا قصبہ گنگوہ ضلع سہارنپور ہے۔ آپ ماں اور باپ دونوں سلسلوں سے شریف النسب یعنی نجیب الطرفین شیخ زادہ انصاری اور ایوبی النسل تھے۔ آپ بچپن سے ہی مہذب اور باادب تھے، بے تہذیب اور غیر تربیت یافتہ بچوں کی عادتوں سے طبعاً نفرت تھی۔ اجمالی طور پر اتنا کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالی نے آپ کو ابتدا ہی سے عادات حمیدہ اور خصائل پسندیدہ سے نوازا تھا۔ نوعمری ہی کے زمانے میں آپ کو تعلیم کا شوق پیدا ہوا، فارسی کی کتابیں ''کرنال'' میں اپنے ماموں مولانا محمد تقی صاحب سے پڑھیں، اس کے بعد عربی کا شوق پیدا ہوا اور عربی کی ابتدائی کتابیں مولوی محمد بخش صاحب رامپوری سے پڑھیں، پھر علوم عربی کا تکملہ اور دینیات کی تعلیم حاصل کرکے ایک عالم باعمل بن کر تیار ہوئے، جسے وقت کے علماء نے اپنا مقتدی تسلیم کیا۔ آپ کے علم وفضل کی شہرت عہد شباب ہی میں ہوگئی تھی، مسائل میں آپ کی طرف رجوع کیا جاتا تھا، اہل علم کو اگر کسی مسئلے میں آپ

کی تائید حاصل ہوجاتی تواس کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔

آپ کا دور وہ دور ہے جب مسلم معاشرے میں بدعات وخرافات اور مشرکانہ رسم و رواج کے عروج کی راہیں ہموار ہورہی تھیں، مسلمان ہندو معاشرے سے متأثر ہوکر بہت سی ایسی رسموں میں مبتلا ہورہے تھے جن کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ہندوؤں میں جو رسمیں مروج تھیں، مثلا: مندروں پر سالانہ میلے، درشن کے نام پر چڑھاوے، گانے باجے اور رقص وسرود کی محفلیں؛ مسلمان ناخواندہ اور اسلامی تعلیمات سے ایک حد تک ناواقف ہونے کی وجہ سے ان مناظر کو دیکھ کر ان سے متأثر ہوتے تھے۔ جاہل صوفیا اور مصنوعی پیروں نے ان کی دل چسپی دیکھ کر بزرگوں کے مزاروں اور قبروں کی طرف ان کی رہنمائی کردی۔ چوں کہ یہ عوامی مزاج کے مطابق کام تھے اس لیے ان پڑھ اور ناخواندہ لوگ کارِثواب سمجھ کر مزارات اور قبروں پر عرس کے نام پر سالانہ میلے لگانے لگے اور وہی سب کام کرنے لگے جو انہوں نے برادران وطن کے میلوں میں دیکھا تھا۔

علمائے وقت نے ان حالات کو محسوس کرتے ہوئے اپنی ذمہ داریاں نبھائیں اور اصلاحی مہم شروع کی، عوام کو ان کی غلطیوں سے آگاہ کیا اور دین و شریعت کی صحیح تعلیم سے باخبر کیا۔ حضرت گنگوہی کے دور میں یہ صورت حال مزید ابتر ہورہی تھی، آپ نے ایسے پرفتن دور میں بڑی ذمہ داری کے ساتھ دین کی خدمت انجام دی، اسلام کو ہر طرح کے باطل نظریوں سے محفوظ رکھا۔ ایک طرف آپ مسند ارشاد وسلوک پر متمکن ہوکر تزکیۂ باطن اور تعلق مع اللہ کے پاکیزہ مشغلے میں لگے، دوسری طرف ابتدا ہی سے آپ نے دینی تعلیم کا سلسلہ ''گنگوہ''

میں جاری کیا، ساتھ ہی بدعات وخرافات کی بڑی سختی سے قولا وتحریرا تردید فرماتے رہے۔اس دور میں آپ کی ذات کومرکز ہدایت کی حیثیت حاصل تھی۔

اس دور کی کچھ بدعات وخرافات ملاحظہ کیجیے! کہ مسلمان کس طرح واضح دینی اصولوں کو چھوڑ کرنئی نئی ایجاد کردہ بدعتوں اور خود ساختہ عبادتوں میں مبتلا ہورہے تھے اور حضرت گنگوہی نے کس جرأت ایمانی کے ساتھ مسلم معاشرے کوغیراسلامی طریقوں سے نجات دلانے کے لیے ذمہ داری نبھائی۔

مجلس میلاد: پہلے اس کومجلس میلاد اور اب جشن عید میلاد النبی کہا جاتا ہے۔اس دور میں یہ بدعت گھر گھر میں عام تھی۔حضرت گنگوہی نے اس بدعت کی تردید کی اور واضح لفظوں میں بتایا کہ: مروجہ محفل میلاد چھٹی صدی ہجری کے بعد ایک بادشاہ کی ایجاد کردہ ہے، اس سے قبل پوری اسلامی تاریخ میں اس کا سراغ نہیں ملتا،لہذا یہ بدعت ضالہ ہے۔(فتاوی رشیدیہ ۲۵۴)

عرس: ایک بڑی بدعت عرسوں کی تھی، بڑی دھوم دھام کے ساتھ ملک کے گوشے گوشے میں یہ رسم منائی جاتی تھی۔حضرت گنگوہی نے اس بدعت کی سخت تردید کرتے ہوئے فتوی جاری کیا کہ: کسی بھی عرس میں شریک ہونا درست نہیں ہے، تعین تاریخ سے قبروں پر اجتماع کرنا گناہ ہے،خواہ اورلغویات ہوں یا نہ ہوں۔(فتاوی رشیدیہ ۲۷۴)

اہل قبور سے استعانت: ایک بڑی مشرکانہ گمراہی یہ تھی کہ جاہل عوام بزرگوں کے بارے میں مختار کل اور متصرف فی الامور کے عقیدے کے ساتھ ان کی قبروں پر حاجت روائی کے لیے جاتے تھے، جو کہ صراحتاً شرک ہے۔آپ نے اس گمراہی سے لوگوں کو بچاتے ہوئے فتویٰ جاری کیا کہ: اہل قبور سے

استعانت اور مدد طلب کرنا جس طرح بھی ہو جائز نہیں ہے۔ (فتاوی رشیدیہ ۲۰۱)

اس کے علاوہ بہت سی بدعتیں تھیں۔ مثلاً: مروجہ فاتحہ، تیجہ، چہلم، گیارہویں، برسی، قبر بوسی، تعزیہ پرستی، سجدۂ قبور، طواف قبر، رجبی کونڈے اور محرمی کھچڑا وغیرہ۔ حضرت گنگوہی نے ان تمام بدعات وخرافات کی سختی سے تردید فرمائی اور ان خرافات کو مسلمانوں کے درمیان سے مٹانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ آپ کی ہمہ وقت یہی کوشش رہتی تھی کہ کسی طرح مسلمان حق اور باطل کو سمجھ جائیں اور اس میں امتیاز کا سلیقہ سیکھ جائیں۔ آپ کا احقاق حق اور ابطال باطل کا سلسلہ زندگی بھر جاری رہا اور سرگرمیاں بھی بدستور جاری رہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل بدعت اپنے خول میں سمٹنے لگے، دوسری طرف علمائے دیوبند کی جماعت حضرت گنگوہی کی سرپرستی میں بدعات وخرافات کی تردید میں صف بندی کر کے سامنے آئی، اور حضرت گنگوہی کی ہدایات کی روشنی میں رد بدعات وخرافات پوری جماعت کا مشن بن گیا۔ مباحثوں اور مناظروں کی معرکہ آرائیاں ہوئیں اور قلمی جنگ برپا رہیں۔ ان لوگوں نے مسلمانوں میں اصلاحی انقلاب برپا کیا، جہاں جہاں اہل بدعت نے قلعہ بندی کرنے کی کوشش کی انہوں نے تصنیف و تالیف کے ذریعے ان کے دروازے اکھاڑ دیے، اہل بدعت کے باطل عقائد کو منکشف کر کے دنیا کے سامنے بے نقاب کیا، شرک وبدعت پر جو پردہ ڈال رکھا تھا اس کی اصلی اور سچی تصویر سے پردہ اٹھا کر دنیا کو دکھایا، علماء سوء اور مصنوعی صوفیا کی حقیقت کھولی اور اہل بدعت کو حق پرستوں کی جماعت سے الگ کیا۔ اس تحریک اصلاح میں جو روح دوڑ رہی تھی وہ حضرت گنگوہی کے اظہار حق اور جوش وکردار کی روح تھی، پوری جماعت حضرت گنگوہی سے رجوع کرتی تھی، ان کی

زبان وقلم سے جو بات نکلتی تھی ''پرنہیں طاقت پرواز مگر رکھتی تھی''۔ یہ سب ذہنی و فکری اور عملی انقلاب حضرت گنگوہی کے خلوص اور دینی بصیرت کا صدقہ تھا۔آپ کوفقیہ النفس کا معنیٰ خیز خطاب دیا گیا۔

آج ہندوستان میں شاہراہ اسلام سے جو بدعات وخرافات، خلاف شرع رسم ورواج اور مشرکانہ عقائد کے خس وخاشاک کو صاف کیا گیا ہے، اس میں حضرت گنگوہی کی حیثیت قائد ملت کی ہے۔آپ کی ذات سرچشمۂ نور تھی، جہاں سے رشد وہدایت کی کرنیں پھوٹتی تھیں اور اس کی روشنی ہر چہار سمت پھیل جاتی تھی۔آپ نے باطل کو شکست دے کر ثابت کیا کہ فرمان نبوی میں جو پیشین گوئی کی گئی ہے کہ ''میری امت میں ہمیشہ ایک جماعت ایسی رہے گی، جس کو خدا کی مدد حاصل رہے گی اور وہ ہر محاذ پر کامیاب ہوں گے، یہاں تک کہ قیامت آجائے'' یہ پیشین گوئی برحق ہے اور ''دیوبند'' کے علماء کا کردار اس کی صداقت کی شہادت ہے۔

ابتدا ہی سے دنیا کا یہ دستور رہا ہے کہ جو بھی اس دنیا میں آیا وہ جانے کے لیے ہی آیا، جس کو قرآن کریم میں ان الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ **کل نفس ذائقة الموت**۔ (سورہ آل عمران ۱۸۵) بالآخر ۹/ جمادی الثانی ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۱/اگست ۱۹۰۵ء جمعہ کا دن تھا، ساڑھے بارہ بج چکے تھے، اذان جمعہ ہوچکی تھی، کہ فرشتۂ اجل آگیا اور آپ ۷۸/سال ۷/مہینے ۳/دن کی عمر میں سفر آخرت پر روانہ ہوگئے۔اللہ تعالیٰ آپ کی بال بال مغفرت فرمائے اور آپ کے صدقے میں ہم سب کی بھی مغفرت فرمائے۔**من قال آمین غفر الله له**۔

حضرت مریم نبیہ تھیں یا نہیں؟

امام نووی اور ملا علی قاری نے بعض علماء سے حضرت مریم علیہا السلام کی عدم نبوت پر اجماع نقل کیا ہے۔ (نووی، کتاب فضائل الصحابہ، باب فضائل خدیجہ۔ مرقاۃ المفاتیح، باب بدء الخلق و ذکر الانبیاء)

بہت سے مفسرین اور شارحین حدیث نے اس اجماع کے نقل کرنے کو قابل اشکال قرار دیا ہے۔ جیسے ابوالحسن اشعری، امام قرطبی، ابن حزم ظاہری۔ (الرسل والرسالات، عمر بن سلیمان عتبی)

فتح الباری سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ قرطبی اثبات نبوت میں پیش پیش ہیں۔ علامہ قرطبی کے استدلال سے متأثر ہوکر حافظ ابن حجر بھی ان کے ہم نوا معلوم ہوتے ہیں۔ حافظ ابن حجر نے امام قرطبی کے استدلال کو خوب زور دار انداز میں بیان کیا ہے اور عدم نبوت کے قائلین کی حمایت میں کچھ نہیں کہا ہے۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ حافظ ابن حجر جمہور کے خلاف ہیں۔ (فتح الباری، کتاب الجہاد، باب قولہ تعالیٰ: وضرب اللہ مثلا للذین آمنوا امرأۃ فرعون)

علامہ بدرالدین عینی نے حافظ ابن حجر پر رد فرمایا ہے۔ (عمدۃ القاری ۳۰۹/۱۵ بیروت)

علامہ آلوسی نے اس بات کی تردید کی ہے کہ حضرت مریم کی عدم نبوت

پر اجماع ہے، اور کہا ہے کہ نبوت کا قول مشہور ہے۔تقی الدین سبکی اور ابن سید الناس نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے۔ پھر علامہ آلوسی نے نبوت کے قول کی بھی تردید کی ہے۔(روح المعانی ۱۴۸/۲ بیروت)

حافظ ابن کثیر نے اس باب میں فیصلہ کن اور دوٹوک بات کہی ہے، کہ آیت کریمہ "وما ارسلنا من قبلك الا رجالا" سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی عورت کو نبوت نہیں ملی، اور یہی جمہور کا قول ہے، اگر وہ نبیہ ہوتیں تو مقام مدح میں انہیں ضرور نبیہ کہا جاتا، وہ نص قرآنی سے صدیقہ ٹھہرتی ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر ۳۶۲/۴ بیروت)

۶/دسمبر؛ یوم سیاہ

بابری مسجد کی شہادت صرف ایک شہادت ہی نہیں تھی بلکہ ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات سے کھیلنے کی ایک ناپاک کوشش تھی۔

۶/دسمبر ۱۹۹۲ء ہندوستان کی تاریخ کا وہ سیاہ دن ہے، جس میں ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات سے کھیلا گیا اور ان کی ایک پرانی مسجد کو بے دردی سے شہید کردیا گیا۔ بابری مسجد مغل بادشاہ ''ظہیرالدین بابر'' نے ۱۵۲۷ء میں اترپردیش کے ضلع فیض آباد کے شہر ''ایودھیا'' میں ''میر باقی'' کے ذریعے تعمیر کرائی تھی۔ ایک عرصے تک مسلمان اس میں عبادت کرتے رہے۔ ایک لمبے زمانے کے بعد انتہا پسند ہندوؤں نے یہ دعویٰ کیا کہ یہ مسجد ہندو دیوتا ''رام'' کی جائے پیدائش پر قائم کی گئی ہے اور مندر کو توڑ کر بنائی گئی ہے۔ بات جب زیادہ آگے بڑھی تو ۱۸۵۹ء میں انگریز حکمرانوں نے عبادت کی جگہ کو دو حصوں میں تقسیم کردیا، اندر کا حصہ مسلمانوں کے لیے اور باہر کا حصہ ہندوؤں کے لیے۔ پھر ایک وقت وہ آیا کہ ۱۹۴۹ء میں مسجد کے اندر مورتیاں رکھ دی گئیں اور ظاہر کیا گیا کہ کہ رام تشریف لا چکے ہیں۔ اس سازش کے نتیجے میں بہت فسادات ہوئے۔ بالآخر حکومت وقت نے مسجد میں تالے لگوا دیے۔ پھر ۱۹۸۴ء میں

ہندوؤں نے مسجد کی جگہ ''رام مندر'' تعمیر کرنے کے لیے ''وشو ہندو پریشد'' کی قیادت میں ایک تحریک چلائی، بعد میں اس تحریک کی قیادت ''اڈوانی'' نے سنبھالی۔ ۱۹۸۶ء میں ضلعی جج نے مسجد کے دروازے کھلوا کر ہندوؤں کو اپنی عبادت کرنے کا حکم دے دیا۔۱۹۹۱ء میں یوپی میں ''کلیان سنگھ'' کی قیادت میں ''بی جے پی'' کی حکومت قائم ہوئی۔ ۱۹۹۲ء میں انتہا پسند ہندوؤں نے ایک بھیڑ کی شکل میں اکھٹا ہوکر مسجد کو شہید کر دیا۔اس کے بعد ملک بھر میں ہندو مسلم فسادات شروع ہوئے، لاکھوں لوگ مارے گئے، ہزاروں گھر برباد اور جل کر خاکستر ہو گئے، کتنے بے گناہ شہید ہوئے، ظلم وستم کی حدیں پار ہوگئیں، لیکن آج تک کوئی ملزم گرفتار نہیں ہوسکا؛ اسے مسلمانوں کی بدقسمتی کہیے یا کمزوری!

یہ کھلا ہوا ظلم وستم اور خونی داستان نسل در نسل منتقل ہوگی، جب تک ہندوستان میں مسلمانوں کی حمیت، غیرت، عزت نفس، خودداری اور اپنی عبادت گاہوں سے محبت باقی ہے؛ بابری مسجد کی شہادت یاد رہے گی اور ہمیشہ تڑپاتی رہے گی۔

سہہ رہے ہیں ہم ظلم وستم دنیا والوں کے
اے حکام! تمھیں تمہاری حکمرانی مبارک ہو

متفرقات

کتابیں ہیں چمن اپنا

کتاب کی عظمت و اہمیت ہر زمانے میں مسلم رہی ہے، کتاب وہ بے جان استاذ ہے جو علوم وفنون کے ذخیرے ہمارے اندر منتقل کرتا ہے، ہمیں تو کتاب کے بغیر چین ہی نہیں آتا ہے، ہمارے لیے سب سے مشکل وقت وہ ہوتا ہے جو کتاب کے بغیر گزرتا ہے، وقت کو چن چن کر کتاب کی نذر کرتے ہیں، جب کوئی نئی کتاب ہاتھ لگتی ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے کوئی خزانہ ہاتھ آ گیا ہو۔ الغرض صدیاں گزر جانے کے باوجود بھی کتاب کی رفاقت وہم نشینی سے گریز نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ مادیات کے عروج اور سوشل میڈیائی دور میں کتاب دوستی ایک نازک اور حساس مسئلہ بن گئی ہے، نئی نسل سے امید اس لیے نہیں لگائی جاسکتی کہ انہیں سوشل میڈیا کے نشے نے اندھا اور بہرا بنا دیا ہے، ان کے پاس اتنا وقت کہاں کہ کتاب سے دوستی کر سکیں اور علوم وفنون کے ذخیرے اپنے اندر منتقل کر کے اپنا مستقبل سنوار سکیں۔

اقسام حدیث کے متعلق ایک وضاحت

متقدمین کے نزدیک حدیث کی دو قسمیں تھیں، صحیح اور ضعیف۔ وہ حسن کو صحیح میں ہی داخل مانتے تھے۔ حافظ ابن تیمیہ سے چوک ہوئی ہے، انہوں نے

کہا ہے کہ امام ترمذی نے سب سے پہلے حسن کی تقسیم کی ہے، حالاں کہ یہ صحیح نہیں ہے؛ کیوں کہ امام ترمذی سے پہلے امام شافعی نے ''کتاب الام'' میں اور بہت سے متقدمین نے حسن کا تذکرہ کیا ہے، ہاں البتہ امام ترمذی نے حسن کا تذکرہ کثرت سے کیا ہے۔ ابوسلیمان خطابی پہلے شخص ہیں جنھوں نے حسن کو حدیث کی ایک قسم قرار دیا ہے، ان سے پہلے لوگوں نے حسن کا تذکرہ تو کیا ہے لیکن مستقل قسم نہیں قرار دیا ہے۔ حافظ عراقی کہتے ہیں کہ ہم نے صراحتاً تین قسمیں نہیں دیکھی ہیں، لیکن چوں کہ خطابی معتمد آدمی ہیں اس لیے ان کی بات صحیح ہے کہ حدیث کی اصحاب حدیث کے نزدیک تین قسمیں ہیں؛ صحیح، حسن، ضعیف۔

چار عورتوں سے شادی

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے بیویوں کی تعداد کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ: ایک بیوی والا شخص مریض ہے، بیوی بیمار ہو تو یہ بھی بیمار ہو جاتا ہے، اُسے حیض آئے تو اِسے بھی آ جاتا ہے، وہ روزہ رکھے تو اس کا بھی روزہ ہو جاتا ہے۔ دو بیویوں والا دو انگاروں کے درمیان ہے، جو بھی اسے پالے جلا دیتا ہے۔ تین بیویوں والا ہر روز ایک نئی بستی کا مہمان ہوتا ہے (ہر روز مہمان کی طرح اس کی خاطر مدارت ہوتی ہے)۔ اور چار بیویوں والا تو ہر روز ہی دولہا ہوتا ہے (باری میں تاخیر اور سوکنوں کی کثرت کی وجہ سے ہر بیوی اپنی باری میں دولہے کی طرح اس کا استقبال کرتی ہے، اور دلہن کی طرح تیار ہوتی ہے)۔ (سیر اعلام النبلاء للامام الذہبی ۳/۳۱)

علوم وفنون کی ایک جامع شخصیت

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ جیسی شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ جماعت دیوبند میں تھانوی جیسی علمی شخصیت ابھی تک نہیں آئی، اللہ تعالیٰ نے ان کو جامعیت یعنی تمام علوم میں مہارت کا ملکہ عطا فرمایا تھا، بے شمار علوم وفنون پر مشتمل ان کی ہزاروں کتابیں اس کی شاہد ہیں۔۔۔

لیکن افسوس یہ ہے کہ اس شخصیت کو جس نگاہ سے دیکھنا چاہیے تھا ہم نے نہیں دیکھا، ان کے علوم وفنون اور افکار وخیالات وغیرہ کی نشر واشاعت اور تحقیق وتوضیح پر جو کام ہونا چاہیے تھا وہ آج تک ہم نہیں کر سکے؛ یہی وجہ ہے کہ ان کی زیادہ تر کتابیں نایاب ہوتی چلی جارہی ہیں۔۔۔ میں یہ بات حلقۂ احباب میں ہمیشہ کہتا رہا ہوں۔ چند دن پہلے ایک بڑے عالم کے سامنے یہ بات کہی تو ان کا جواب کچھ اس طرح تھا کہ اس شخصیت کو دبانے کی کوشش کی گئی ہے۔ خیر یہ ان کا جواب تھا۔۔۔

کرونا وائرس

ایک قدیم تحقیق کے مطابق ''کرونا وائرس'' آج کی دریافت نہیں ہے بلکہ جانوروں میں ''نیمونیا'' پیدا کرنے کا سبب بھی یہی وائرس ہے۔ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ بیماری انسانوں کو چھوت کے طور پر چوپایوں سے لگتی ہے۔ سب سے پہلے یہ بیماری ٹورانٹو (کنیڈا) سے پھیلی، بعض لوگوں کا خیال

ہے کہ یہ بیماری سب سے پہلے چین کے بوچر خانہ (گوشت بازار) سے گوشت فروشوں کے ذریعے پھیلی۔ دسمبر ۲۰۰۳ء کے آخر اور شروع جنوری ۲۰۰۴ء میں جب یہ بیماری چین میں پھیلی تو بلیوں کے ذریعے پھیلنے کا شبہ ہوا، جس کی وجہ سے ہزاروں بلیوں کو مار دیا گیا تھا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ''کرونا وائرس'' نامی مہلک بیماری ماضی میں کئی مرتبہ پھیلی ہے، جس نے چائنا، ہانگ کانگ، ویتنام، سنگاپور، کنیڈا اور تائیوان میں ہزاروں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ ''کووڈ ۱۹'' اسی ''کورونا وائرس'' کے قبیل سے ہے اور اسی کی ایک قسم ہے، جو کہ آج کی دریافت ہے۔

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ

اللہ تعالی کی سنت جاریہ ہے کہ جس دور میں بھی دین کی خدمت کے لیے افراد و جماعت کی ضرورت پڑی تو اللہ تعالیٰ نے مردوں کے ساتھ عورتوں سے بھی کام لیا۔ خواتین نے ہر دور میں اپنے تناسب اور حیثیت کے اعتبار سے دین کی خدمت انجام دی ہے۔ شروع کی صدیوں میں خواتین نے احادیث کی جمع وترتیب، دینی علوم وفنون کی نشر و اشاعت، دینی مدارس کا قیام اور دیگر رفاہی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اسی طرح جب چھٹی اور ساتویں صدی میں صلیبی درندوں اور تاتاری بھیڑیوں کی وسط ایشیا کی اسلامی مملکتوں اور شہروں پر یلغار کے نتیجے میں مسلمانوں کے ساتھ اسلامی علوم وفنون میں بھی تباہی آئی تو اللہ تعالی نے اس دور میں مردوں کی طرح عورتوں کی جماعت سے بھی کام لیا،

جنھوں نے علمی اور دینی کاموں میں تجدیدی خدمات انجام دیں؛ ان میں بہت سی معمرہ تھیں جنھوں نے لمبی عمریں پا کر اپنا فیض جاری رکھا، تاریخ اس کی گواہ ہے اور مؤرخین نے ان معمرات کے تذکرے میں اس امتیاز کو خاص طور سے بیان کیا ہے۔

ہماری بے مقصد زندگی

آج ہمارا حال یہ ہے کہ ہمیں اپنی حقیقت کا ہی علم نہیں، ہمیں معلوم ہی نہیں کہ زندگی کیا ہے؟ زندگی کتنی وسیع، کتنی عمیق، کتنی نازک اور کتنی لطیف ہے؟ زندگی گزارنا کتنی بڑی ذمہ داری ہے؟ زندگی کے دریا کو عبور کرنے اور اپنی کشتی کو پار لگانے کے لیے کن بنیادی حقیقتوں پر ایمان لانے اور ان پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہنے کی ضرورت ہے؟ آج ہماری زندگی سیل رواں کی طرح بہتی جا رہی ہے۔ اس دنیا کو کس نے بنایا؟ کیوں بنایا؟ زندگی کیوں عطا کی گئی؟ ہم کہاں سے آئے ہیں؟ کہاں جانا ہے؟ کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔ آج کے اس متمدن اور ترقی یافتہ دور کی بدقسمتی یہی ہے کہ ہم حیاتیات کے مقصد سے ناواقف ہیں اور افسوس کہ معلوم ہونے کی خواہش بھی نہیں رکھتے۔ آج ہم سورج کی شعاؤں کو گرفتار کر سکتے ہیں، چاند پر پہنچ سکتے ہیں، سمندر کی تہہ سے موتی نکال کر لا سکتے ہیں اور پوری کائنات کو مسخر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں؛ لیکن کیا ہم کو زندگی کا مقصد بھی معلوم ہے؟ اگر ہم مقصد زندگی سے ناواقف ہیں، تو ان کمالات و ترقیات اور تسخیر کائنات سے کیا حاصل؟

اراکان میں ظلم وستم کی انتہا

ہر آنے والا مؤرخ جب ظلم وستم کی تاریخ مرتب کرے گا تو ''اراکان'' کے مظلوم مسلمانوں کو نظر انداز نہیں کرے گا اور جلی الفاظ میں یہ لکھے گا کہ: وقت کے طاغوتوں نے اراکان کے مسلمانوں کے ساتھ وہ ظلم ڈھایا جس کی مثالیں تاریخ انسانی میں بہت ہی کم ہیں۔اور ساتھ میں یہ بھی لکھے گا کہ: لعنت ہو وقت کے ان مسلم حکمرانوں پر جو اس دردناک صورت حال میں خاموشی کے ساتھ اپنے محلوں میں بیٹھ کر تماشہ دیکھ رہے تھے۔

زبانوں کا بگاڑ

مجھے سب سے زیادہ پریشانی اس شخص کی گفتگو سے ہوتی ہے جو اپنے کلام میں مختلف زبانوں کے الفاظ بولتا ہے۔یعنی اردو، ہندی اور انگلش وغیرہ کے الفاظ ملا کر بولتا ہے۔گویا کہ زبان کا معجون مرکب بنا دیتا ہے۔اس طرح کی گفتگو سے ہماری روح مع وجود بے چین ہو جاتی ہے۔اسی طرح سب سے زیادہ کلفت اس تحریر کو پڑھنے سے ہوتی ہے جس میں مختلف زبانوں کے الفاظ لکھ دیے جاتے ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ ایک ''معجون مرکب زبان'' وجود میں آرہی ہے۔ہم اس کو نئے دور کی وبا کا نام دیتے ہیں۔اس لیے کہ یہ طرز اصل زبانوں پر کاری ضرب لگا رہا ہے اور زبانوں کی تہذیب وثقافت اور ان کے وجود کو متأثر کر رہا ہے۔